

خوابوں کی گہرے میں پڑی لڑکی

UQAABI

03055198538

غافر شہزاد

گورا پبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور

خوابوں کی گہریں پڑی لڑکی

غافر شہزاد

گور اپبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور



ناشر :
طاہر اسلام گورا

جملہ حقوق محفوظ

بار اول : ۱۹۹۵ء
زاہد بشیر پرنٹرز - لاہور
سرورق : امجد رفیق
قیمت : ۷۰ روپے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS

انتساب!

خوابوں کی گرہ میں

پڑھی ہوئی

ایک لڑکی کے نام

ترتیب

- مستمر حسین تارڑ ۹
○ مسعود اشعر ۱۱
○ یوسف حسن ۱۳

- خواب خواہش
۱۷ خواب اور خواہش کے درمیان
۲۵ اپنا اپنا سچ
۳۰ گرین ہاؤس
۳۷ سرنگ کے کنارے
۴۴ گلاس وال

- خواب عذاب
۵۲ خوابوں کی گرہ میں پڑھی لڑکی
۵۷ عذاب النار
۶۳ ایک جنم اور

خواب خراج

۷۱

آخری سورج

۷۶

بائیل

۸۲

ایک خواب کی بشارت

۸۸

صبحِ کاذب

۹۵

سنہری حروف

۱۰۳

پوری بات ادھوری

خواب خزاں

۱۰۹

دیوار پر لٹکا ہوا آدمی

۱۱۵

گھٹی کاموڑ

۱۲۰

فن کار

۱۳۱

نگون

○ مستنصر حسین تارڑ۔۔۔۔۔

ہماری نسل شائد خوش قسمت تھی۔

ہم میں سے کچھ ایسے ہیں، جن کے لاشعور میں کہیں آج بھی روم جل رہا ہے، لاہور جل رہا ہے۔ ایک دھندلی سی یاد ملک کی تقسیم کی اور بننے والے لو کی، لیکن جو تصویر ابھی دھندلی نہیں ہوئی وہ مارشل لاز کی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کی ہے جسے ہم "سقوطِ ڈھاکہ" ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، "یا غروبِ مشرقی پاکستان" کے شوگر کوٹڈ لفظوں میں بیان کرتے ہیں ہم میں نہ ہمت ہے کہ اسے شکست کہیں اور نہ جرات ہے۔ جرات ہوتی تو شکست نہ ہوتی۔

چنانچہ ہماری نسل شائد خوش قسمت تھی اور ہے کہ ہمیں ایسے واقعات اور سانحات میں سے گزرنے کا موقع ملا جو صدیوں کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں (یا ہونے چاہیں) ان کی اثر انگیزی ہم پر ایسی تھی کہ ہم از حد ناخوش ہوئے، ہمارے اندر ایک گہری خاموشی، ضبط اور غصہ تھا جسے ہم نے تحریروں میں ڈھالنے کی کوشش

○ مسعود اشعر -----

غافر شہزاد کے افسانے ایک ایسے نوجوان کا حیاتی گوشوارہ بناتے ہیں۔ جو ہر شے اور ہر واقعہ کو جذبات کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہے لیکن یہ جذبات فکر سے یکسر عاری بھی نہیں ہیں۔ ہر نوجوان کی طرح ان کے ہاں بھی جذبات اور فکر کی کشمکش ہر سطح پر موجود رہتی ہے وہ بلی کی آنکھیں ہوں، یا گرین ہاؤس اثر یا گھر کی دہلیز تک پہنچ جانے والی جنگ، یہی کشمکش ان کے افسانوں کا تانا بانا بناتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اپنے آپ کو، اپنے ماحول کو اور اپنے عہد کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ کوشش اشاراتی اور ایمانی انداز میں بھی ہے اور سیدھے سادے بیانیہ اسلوب میں بھی، ان کا غور و فکر کہیں کہیں انہیں احتجاج پر بھی اکساتا ہے لیکن یہ احتجاج ایک ہلکی سی درد مندی سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور یہ ان کی خوبی ہے۔ چیزوں کے سیاہ و سفید دونوں رخ پیش کر کے اپنی بات میں اثر پیدا کرنا ایک عام طریقہ ہے غافر شہزاد اس تکنیک

کو فن کارانہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ہمارے ہاں افسانوں میں زبان پر محنت کرنے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ غافر شہزاد اس حقیقت سے باخبر ہیں اور ان کی یہ باخبری ہی انہیں زبان کی طرف توجہ دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زبان کا تخلیقی استعمال کہانی کو اس کی معراج عطا کرتا ہے۔ غافر شہزاد نے ابھی اپنے سفر کا آغاز کیا ہے ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور وہ کہنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ اچھے ادب کا مطالعہ اور محنت یقیناً انہیں اپنا مسترد راستہ بنانے میں مدد دے گی۔

۹، جنوری ۱۹۹۵ء

حقیقت پسندی کی نئی روایت کا افسانہ نگار

ہمارے ہاں زرعی بوڑھواری سے تعلق رکھنے والے ادبی جدیدیت پسند ہوں یا متوسط طبقے سے ابھرنے والے، دونوں کی کوششیں یہی رہی ہیں کہ ادبی حقیقت پسندی کو ایک غیر تخلیقی اور فرسودہ رجحان اور ادبی جدیدیت کو واحد جدید ترین تخلیقی رجحان کے طور پر تسلیم کرائیں۔ مگر ادبی حقیقت پسندی ایسی سخت جان ہے کہ مٹانے نہیں مٹی بلکہ سماجی اور فنی و تکنیکی ترقیوں کے ساتھ مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور ارتقائی صورت میں ہر نئی نسل کے اہل قلم میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔

پاکستانی افسانے میں ساتویں دہائی کے آس پاس جب غمگینی آمریت کے زیرِ سایہ ادبی جدیدیت میں بھی زبردست ابھار آیا، حقیقت پسندی کی روایت میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں اور آٹھویں دہائی تک اور اس کے بعد یہ تبدیلیاں حقیقت پسند اردو افسانے کے نئے نمایاں اوصاف میں ڈھل گئیں۔ اب تو صریح پسندی اور تفصیل نگاری کی جگہ اشارہ پسندی اور اختصار نویس نے لی۔ اور کہ اوروں کی خارجیت کے ساتھ ان کی داخلیت کے مشاہدہ و مطالعہ اور ترجمانی کا رجحان بڑھا۔ اردو افسانے میں موجود حقیقت پسندی بعض مثبت پہلوؤں سے ساتویں دہائی سے پہلے کی حقیقت پسندی سے ہم

رشتہ ہونے کے باوجود اس سے واضح طور پر مختلف ہے۔ خافر شہزاد مجموعی طور پر حقیقت پسندی کی اس نئی روایت کے جواں سال افسانہ نگار ہیں۔

خافر شہزاد نے بیسویں صدی عیسوی کے نوے عشرے کے تقریباً ساتھ ساتھ ہی لکھنا شروع کیا۔ جب ملک پر دوسری اور قدامت پرست عسکری آمریت مسلط تھی، جس نے متوسلہ تہذیب کے ادبی جدیدیت پسندوں کو بھی ترقی پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے قریب ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ خافر شہزاد نے اسی عشرے کے آخری سال میں "تصویریں سانس لیتی ہیں" کے نام سے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ پیش کیا۔ جس میں حقیقت پسندی کا انداز فکر و احساس ان کے بیشتر افسانوں کے ساتھ ایک نیم افسانے 'اے' سے مکالمہ میں بھی موجود ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔۔۔

"مجھے جو کچھ معاشرے نے دیا اس کو تمام تر بد قوتوں کے ساتھ لوٹا رہا ہوں۔"

(تصویریں سانس لیتی ہیں صفحہ ۱۲۳)

یہ فقرہ پڑھ کر ساحر لدھیانوی کا یہ مشہور شعر یاد آتا ہے کہ

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

خافر شہزاد کے فقرے اور ساحر لدھیانوی کے شعر سے مغالطہ

پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید دونوں ادبی نیچر لازم کے قائل ہیں۔ جبکہ فی

الحقیقت اپنے اپنے شعبہ ادب میں دونوں ریلیٹ (حقیقت پسند) ہیں۔ جو نیپرلزم سے مختلف طریق کار ہے۔ بہر حال غافر شہزاد نے حقیقت پسندی کی ارتقاء یافتہ روایت میں افسانہ لکھنے سے اپنا سفر شروع کیا۔ اور اپنے پہلے مجموعے ہی سے اپنے قارئین کو یہ خوشگوار حسرت بخشی کہ اس نوجوانی ہی میں جدیدیت کی داخلیت پسندی کی بجائے کرداروں کی داخلیت کو موعوضیت کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا فنی رویہ رکھتے ہیں اور اس طریق کار میں اپنی منفرد فنی جمالیاتی انفرادیت کی تشکیل کر رہے ہیں۔

’خوابوں کی گرد میں پڑھی لڑکی‘ غافر شہزاد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے افسانے پچھلے چند برسوں میں لکھے گئے ہیں ہر چند ان کے اس مجموعے میں بھی کچھ علامتی و استعاراتی افسانے موجود ہیں۔ جو فکری رویے کے اعتبار سے حقیقت پسندانہ ہیں اور جدیدیت پسندوں کے برعکس معنوی ابلیغ کے حامل ہیں۔ تاہم اس مجموعے میں بھی ان کا غالب رجحان حقیقت پسندی کے غیر علامتی و استعاراتی اظہار کی طرف ہے۔

غافر شہزاد کے افسانوں کے کردار نہ تو جدیدیت پسندوں کے محبوب، بے پرواگی کے مارے ہوئے اینٹی ہیرو ہیں اور نہ عامیانہ فکشن کے سپر ہیرو، کہ یہ دونوں غیر حقیقت پسندانہ ناانسانی صورتیں ہیں۔ ان کے کردار ہمارے سماں کے عام افراد ہیں جو

ہوڈروائرشن کے بڑھتے ہوئے رشتوں اور مظاہر میں خارجی اور داخلی آشوب سے دوچار ہیں جو مختلف شکلوں کی مغارت، انف ادیت کی شناخت کھو جانے اور انسانی سطح پر نہ جی سکے کا ہے۔ جس کو وہ انسان کے بحیثیت ایک نوعی ہستی کے، علی انسانی اقدار کے ساتھ جینے کی تمنا اور سعی کے ہم اوپیش کرتے ہیں۔

خافہ شہزاد کے حقیقت پسندانہ افسانوں میں جمالیات کی تخلیق کے شعری عناصر تشبیہات و استعارات کا استعمال پہلے بھی کھتا۔ اس مجموعے کے حقیقت پسندانہ افسانوں میں یہ عناصر برائے نام رو گئے ہیں۔ وہ واقعیت کے حامل واقعات کو غیر تشبیہاتی و استعاراتی پیرانے میں پیش کرتے ہوئے ان کے ذریعے اپنے کرداروں کی بدلتی ہوئی داخلیت کو سامنے لاتے ہیں۔

یوں انھوں نے سادہ بیانیہ کے ساتھ داخلیت کی ترجمانی اور جمالیات کی تخلیق کی ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تو خف و تفصیل کی بجائے اختصار پسندی کو بھی اپنایا ہے۔ اس طرح اپنا سفر مزید دشوار کر لیا ہے۔ یہ ذمہ داری بڑی اور یہ سفر دشوار سنی وہ اس میں درجہ بدرجہ کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان کی فنی انف ادیت کھتی تلی جا رہی ہے۔

یوسف حسن

۱۰- فروری ۱۹۹۵ء

راولپنڈی

خواب اور خواہش کے درمیان

معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہرہ تھا جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ یوں تو نیند میں آنکھ کھل ہی جاتی ہے مگر سونے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا اور وہ پہلو بدل کے پھر سو جاتا ہے بلکہ لکھنے والے تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ خواب دیکھتے ہوئے بھی کئی بار آنکھ کھل جاتی ہے مگر سونے والا پہلو بدل کر جب دوبارہ سو جاتا ہے تو خواب کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے اس روز بھی ویسا ہی ہوتا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی نرم نرم شے کو چھو رہا ہے یہ سر دیو کی رات تو تھی نہیں کہ وہ سوچتا ایرانی کھل کی نرمی کو چھو رہا ہے۔ بالکل ایک لمحے کا احساس تھا کہ خوف اس کی رہڑھ کی بدٹی میں اتر گیا۔ جیسے آسمانی بجلی چمکنے کے بعد بھی دیر تک روشنی کی لکیر نظر آتی ہے۔ اس اچانک خوف کی کیفیت نے اسے یک دم بستر سے اٹھایا نہیں بلکہ یونہی اسی حالت میں لیٹے لیٹے اس نے دو تین بار آنکھوں کو جھپکا اور یقین کر لینے کے بعد کہ اس کی آنکھیں پوری طرح دیکھ سکتی ہیں اور وہ بیدار ہو چکا ہے اس نے وہیں لیٹے لیٹے آنکھوں کو اس زاویے سے گھمایا کہ وہ اس نرم نرم موس ہونی والی چیز کو دیکھ سکے۔ رات کے اس پہر میں چاندنی کھڑکی سے اندر آرہی تھی مگر پردوں کی وجہ سے کمرہ

پوری طرح روشن نہیں تھا اس نیم اندھیری فضا میں اسے یہ جاننے میں قسطاً دیر نہ لگی کہ اس کا ہاتھ بلی کی پشت پر ہے۔

بلی اس لمحے تک اپنا منہ اگھے دونوں پاؤں میں رکھے شاید سو رہی تھی۔
 سونے سے قبل اس نے کھر کی بند کر دی تھی۔ جو بیٹ کھلا تھا اس کے آگے
 جالی لگی تھی۔ البتہ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی اس نے رات سونے سے قبل
 ٹیرس پر کھینے والا دروازہ خود بند کیا تھا۔ یہاں بھی کھر کی کا وہی پٹ کھلا چھوڑا تھا جس
 کے آگے جالی لگی تھی اور بلی تو کیا کھر کے بھی اندر آنے کی گنجائش نہیں تھی۔

تو پھر یہ بلی میرے کمرے میں کیسے آ گئی۔ ایک عجیب سے خوف کی لپیٹ
 میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مسلسل اس بات پر سوچے جا رہا تھا کہ بلی
 کے کمرے میں داخل ہونے والے ممکنہ راستے کون سے ہیں مگر تاحال معاملہ لا-منحل تھا۔
 اس دوران بہت کمرے وہ اٹھ بیٹھا تھا اور اس سرسراہٹ پر بلی نے پہلے
 آنکھیں کھولیں اور چوکنی ہو کر بیٹھ گئی وہ اپنی جگہ خوف زدہ بستر پر ایک طرف سمٹ
 گیا تھا بلی پہلے تو اسی طرح بیٹھی رہی اور مسلسل اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر معلوم
 نہیں اسے اس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا۔ چند لمحے یونہی بیٹھنے کے بعد بلی اٹھی اس
 نے ایک انگڑائی لی اور پھر نہایت اطمینان سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اودھ کھلے دروازے
 سے باہر نکل گئی۔

وہ تمام وقت جب بلی کمرے میں بیٹھی اسے دیکھتی رہی تھی اس نیم اندھیرے
 کمرے میں جہاں جانہ فی کی معدوم روشنی پہنچ رہی تھی اسے بلی کی آنکھوں میں ایک
 عجیب طرح کی چمک سی نظر آتی تھی اور یہی چمک اس کے لیے باعث پریشانی تھی۔

اس کے تمام تر چاہنے کے باوجود بلی اس کی زندگی کے شب و روز سے نکل
 نہیں سکی اور یہ کوئی ایک محسوس بلی نہیں تھی کہ جو اس سے اتنی مانوس ہو گئی ہو کہ
 اس کا پچھا نہیں چھوڑ رہی تھی بلکہ مختلف وقتوں میں اور مختلف جگہوں پر یہ بلیاں تبدیل

ہوتی رہتی تھیں۔

ایک عرصے تک تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ یہ ایک بلی ہے یا مختلف وقتوں میں مختلف بلیاں ہیں۔ رنگ و نسل مختلف ہونے کے باوجود وہ کبھی ان میں امتیاز نہ کر سکا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کے ذہن پر کسی ایک بلی کے نقش اور رنگ واضح شناخت کے ساتھ ثبت ہی نہیں ہوئے، ایسے میں ظاہر ہے کہ وہ مختلف بلیوں میں کیسے امتیاز کر سکتا تھا۔

یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ اوائل جوانی تک وہ مختلف کاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا اسے سوزوکی اور شیراڈ ایک جیسی بظاہر نظر آتی تھیں مگر ان کے مختلف ہونے کا احساس ضرور ہوتا تھا مگر وہ اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح سٹی اور کڈلا میں تمیز کرنا قدرے مشکل تھا مگر یہ تب تک تھا جب تک اس نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی اب تو وہ دور جاتی ہوئی گاڑی کی ایک جھلک دیکھ کر اس کا ماڈل تک بتا دیتا تھا۔

مگر بلیوں کے معاملے میں وہ عجیب سی کنفیوژن کا شکار تھا۔ سوائے رنگ کے اور کوئی بھی نشان امتیاز نہیں تھا سو اس کی لغات سفید بلی سیاہ بلی یا بھوری بلی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔

جب اس نے ہوش سنبھالا، اسے یاد پڑتا تھا کہ اس کی ماں نے ایک سفید بلی پال رکھی تھی جسے وہ روزانہ باقاعدگی سے دودھ پلاتی تھی۔ گھر میں دودھ کم ہونے کی وجہ سے جانے میں توانا نہ ہو سکتا تھا مگر بلی کی خوراک میں کمی نہیں ہو سکتی تھی جب اس کی بہن بڑھی ہوئی تو اپنی ماں کی تقلید میں اسے بھی بلیوں سے محبت ہو گئی اور نتیجتاً اس کی ماں کو اس کی بہن سے بے پناہ محبت ہو گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ اسے بلیوں سے نفرت تھی مگر اسے کوئی ایسی رغبت بھی نہ تھی اس کے والد کا قالیسٹوں کا کاروبار تھا اور وہ زیادہ تر بیرونی ممالک کے دورے پر رہتے یا پھر اپنے شوروم پر رات گئے تک مصروف رہتے کیونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ نسل کے کارپٹ

کی خریدار بڑی بڑی گاڑیوں میں آنے والی بیگمات رات گئے تک شوروم پر آتی رہتی تھیں۔

اس کا زیادہ تر وقت گھر یا کلچ میں کھتا۔ ہر دو جگہ پر اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا گھر میں بھی ماں اور بہن کی موجودگی میں بھی وہ تنہا ہی ہوتا اور کلچ میں بھی وہ کوئی خاص دوست نہ بنا سکا۔ نہ تو اسے کلچ میں تنہائی نے کبھی ڈیپرس کیا تھا۔ اور نہ ہی گھر میں ماں اور بہن کی بلیوں کے لیے بے تحاشا محبت نے اسے کبھی ڈسٹرب کیا تھا۔ اس کے چہرے پر کبھی ناگواری کے تاثرات پیدا نہیں ہوئے تھے مگر اس کے باوجود کبھی اس کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ ان بلیوں میں سے کسی کو ہاتھ لگائے، اٹھائے یا بستر پر سلائے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ ان بلیوں کی موجودگی کو وہ محسوس نہ کرتا تھا۔

پہلے پہلے کبھی کبھار ماں اس کو دودھ دیتی تھی کہ وہ بلی کو چلا دے۔ مگر اس کی طرف سے بالکل غیر جذباتی رویہ دیکھ کر یہ چیز بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔

البتہ اس کا والد جب فارغ ہوتا تو لالچ میں یا لان میں بلی کو گود میں بٹھائے اس کے نرم بالوں پر ہاتھ پیرتے ہوئے ایک عجیب سی لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل سی ہونے لگتیں اور وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں چلا جاتا۔ بعض اوقات میز پر پریشی جاتے ٹھنڈی ہو جاتی مگر اسے احساس ہی نہ ہوتا تھا ہر بات اس نے نوٹ کی تھی۔ مگر ایسے ہی جیسے نوٹ کرتا تھا ویسے ہی بھلا دیتا تھا اس کے والد کی گھر میں اس سے زیادہ کوئی مصروفیت نہ ہوتی تھی۔ کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا۔ دوست احباب سے تعلق جو کہ محض بزنس کا ہی تھا شوروم تک ہی محدود تھا۔

البتہ اس کی ماں خاصی چلت پھرت عورت تھی اور زندگی کو خوب طمطراق سے گزار رہی تھی ویسے بھی جو وہ چاہتی تھی گھر میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ بیسار رنگ چاہتی تھی گھر کی فضا ویسے ہی ہو جاتی تھی۔ اسے مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بازار جاتی تو

دھیر ساری شاپنگ کرتی۔ اپنی پالتو بلیوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتی۔ فون پر اپنی سہیلیوں سے تنویل گفتگو اس کی دن بھر کی مصروفیت کا اہم حصہ تھی۔

چار افراد پر مشتمل گھر آنے کی زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی پھر یوں ہوا کہ گھر میں کچھ آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہفتے دس دن کے بعد کچھ مہمانوں کو کھانے پر بطور خاص مدعو کیا جانے لگا۔ کبھی اس کی ماں اور بہن بھی اس طرح کے کھانے پر مدعو ہوتیں۔ اس نے کبھی شرکت نہیں کی۔ سچ پوچھئے تو اس کی شرکت پر کسی نے اصرار نہیں کیا۔ اس گھما گھمی کا نتیجہ نکلا اور ایک دن اس کی بہن سسرال کو مدعو ہوئی۔ چند دنوں کے بعد گھر کی فضا پھر ویسی ہی ہو گئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ساکن، سسرال سے پہلی مرتبہ جب اس کی بہن میکے آئی تو اس نے ماں سے ملنے کے بعد اپنی بلیوں کو دھیر سارا پیار کیا۔ دیر تک ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ انہیں بھیسنہتی رہی۔

اس کی بہن کے سسرال چلے جانے کے بعد گھر تقریباً خاموش قبرستان کی صورت اختیار کر گیا۔ جہاں کبھی کبھار اس کی ماں کی فون پر گفتگو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ورنہ اکثر یوں لگتا۔ جیسے ہوا ساکن ہو گئی ہو۔

اور پھر ایک دن ہوا کا ایک خوشگوار جھوٹا اس گھر میں آ نکلا۔ اس کی شادی ہو گئی اس کی بیوی اس کی ماں کا ہی انتخاب تھی۔ بہت ہی سرخ و سفید، لمبے اور گھنے بالوں اور سبز آنکھوں والی اس کی بیوی کا خیال تھا کہ جانتے ہی وہ میاں کو اپنے حسن ادا سے دیوانہ کر دے گی۔ پڑھی لکھی فہمی سے تھی۔ مگر سمجھدار اور قدرے چالاک، ساگ رات ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا میاں برف کی سل ہے، اور نرمی اور گرمی دونوں چیزیں اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ پڑھی لکھی تھی دل میں ہزاروں ارمان لے کر آئی تھی، لہذا جلد ہی مایوس ہونا نہیں چاہتی تھی اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں مگر بے سود، خاوند نے اس کے لیے تعریف کے دو جملے تو دور کی بات، اس کے سراپے کو کبھی نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ شادی کے چند ہفتے بعد ہی ایک ہلکا سا احساس شکست پیدا ہونے

لگا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ آج نہیں تو کل اپنے خاوند کو سپردگی کی لذتوں سے سرشار کر کے اس کے اندر ایک قبولیت پیدا کر لے گی۔

اس کی سیلیوں نے اپنے خاوندوں کے حوالے سے جو قصے سنا لئے تھے۔ یہاں تو صورت حال بالکل مختلف تھی بلکہ ان قصوں کی صداقت مشکوک ہو گئی تھی۔ کتنی ہفتے گزر گئے، جب خاوند کی طرف سے پہل کرنے کی کوئی خاص خواہش نظر نہ آئی تو اس نے خود ہی پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کمرے کی نیم تاریکی میں اس نے خاوند کے گلے میں بائیں ڈال کر کتنی دیر تک اسے بھینچے رکھا اس کے کھلے بال کتنی دیر تک اس کے چہرے پر بکھرے رہے اس نے اپنے سرخ و نرم ہونٹوں کی لپ اسٹک تقریباً تمام ہی اپنے خاوند کے ہونٹوں پر منتقل کر دی مگر اس کی طرف سے کسی پرجوش حرکت کا بکا سا شائبہ بھی نہیں ہوا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کا خاوند عملِ زوجیت کی قوت سے مروم تھا مگر ایک کمی تھی اور وہ پرجوش شرکت کی عدم موجودگی۔ رات جب وہ خاوند کے جسم سے لپٹی تو یوں لگا جیسے پتھر کی ٹھنڈی سل کو گھسے لگا لیا ہو اس ساری صورت حال نے اس کی بیوی کو عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی فیملی سے تھی اور جدید علوم سے بھی بہرہ مند، مگر جس صورت حال کا اسے سامنا تھا اور جس سے وہ گزر رہی تھی اس کا کوئی حل اس کے پاس موجود نہیں تھا۔

بات اگر یہیں تک رہتی تو شاید صورت حال زیادہ سنگین نہ ہوتی۔ چند مہینوں کے بعد ایک عجیب انکشاف ہوا۔ رات سوتے میں اگر کبھی اس کے خاوند کا ہاتھ اس کے کھلے بالوں پر پڑ جاتا، اور اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ عجیب سے خوف میں مبتلا ہو جاتا۔ چونکہ کر پنا باتھ کھینچ لیتا اور پھر کتنی کتنی دیر تک اس کی سانس کی رفتار متوازن نہ ہوتی۔

پہلے تو سے یقین نہ آیا مگر جب تواتر سے یہ عمل دہرایا گیا تو وہ پریشان ہو گئی
تمام تر کوشش کے باوجود بھی اسے سمجھ نہ آ سکی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

وہ اس پتھر کی سیل کے پہلو میں لیٹے ساری ساری رات اس مسئلے کو حل کرتی
رہتی۔ مگر کوئی گرہ نہ کھلتی تھی بعد میں تو اس کے خاوند نے باقاعدہ خوف زدہ ہونا شروع
کر دیا۔ رات جب کبھی اس کا ہاتھ یا بازو اس کے بالوں پر پڑ جاتا اور اس کی آنکھ کھل
جاتی تو وہ گھبرا کر سمٹ کر ایک طرف ہو جاتا۔ اس کی سانسیں تیز ہو جاتیں اور جسم
باقاعدہ کانپنے لگتا۔ کچھ عرصہ تو اس نے اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کی۔ مگر
جب کچھ سمجھ نہ آئی تو اس نے علیحدہ بیڈ پر سونا شروع کر دیا۔

اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اس کا خاوند زیادہ اطمینان سے گہری نیند سونے لگا اور
وہ ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹنے لگی۔

اگلے چند دنوں کے بعد ہی اس کی بیوی نے میکے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے
خاوند کو اور ساس کو یہ خبر سنائی۔ ساس نے صرف اتنا کہا کہ جب دل چاہے فون کر دینا
یہ تمہیں لے آئے گا مگر وہ جس نے لانا سنا تو اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر ابھرا اور نہ
ہی جہرے پر کوئی پھول کھلا، وہ خاموش، چپ چاپ رخصت ہو گئی اور وہ پھر کمرے میں
اکھلا سونے لگا، دن ویسے ہی ہو گئے جیسے شادی سے پہلے تھے۔

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ جب رات سوتے ہوئے اچانک اس کی آنکھ
کھل گئی اور اس نے اپنا ہاتھ نرم نرم بالوں پر محسوس کیا تھا اور وہ چونک گیا تھا۔ بلکہ
خوف زدہ ہو گیا تھا کمرے کی نیم تاریکی میں نیلی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے اسے
بیوی کی سبز آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔

اس کے جاگ جانے کے بعد نیلی تو کمرے سے باہر نکل گئی مگر کمرے میں تنہائی
بھر گئی تھی۔ رات کے اس خاموش پہر میں نیلی کو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے
باہر نکلتے دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی اسے پہلی مرتبہ احساس

ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلا ہے۔

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اس نے ٹیبل لیپ نہیں جلا یا، اور کتنی دیر تک یونی
ساکت و جامد ادھ کھلے دروازے کی جانب دیکھتا رہا جہاں سے بلی نکل کر باہر گئی تھی۔
اسی طرح بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی۔ نہاد صو کر جب ناشتے کی میز پر پہنچا، تو وہی بلی
وہاں موجود تھی اس نے ایک کپ میں تھوڑا سا دودھ ڈالا، اور بلی کی طرف بڑھا دیا۔ بلی
پہلے رکی پھر بڑھی اور اطمینان سے دودھ پینے لگی۔

غیر ارادی طور پر اس نے بلی کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پیرا اور جب تک بلی
دودھ پیتی رہی وہ ہلکے ہلکے اس پر ہاتھ پیرتا رہا۔ دودھ پی چکنے کے بعد اس نے ہولے
سے بلی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور گود میں بٹھالیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پیرنے
لگا۔ ایک عجیب سی لذت تھی جو اس کے اعصاب میں رنگنے لگی۔ وہ اس لذت سے پہلے
آشنا نہیں تھا اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا بلی نے ایک دو بار آنکھیں کھولیں اس کی
طرف دیکھا اور پھر اطمینان سے آنکھیں بند کر کے یونی لیٹی رہی وہ اس کے نرم نرم
بالوں میں ہاتھ پیرتا رہا۔ حتیٰ کہ خود اس کی آنکھیں بھی مختلف نوعیت کی لذت سے
بوجھل ہونے لگیں

(اکتوبر ۱۹۹۳ء)



اپنا اپنا سچ

ہند ٹریل پر جب وہ مخصوص راستے سے اسٹیڈیم میں داخل ہوا۔ تو وہاں پہلے سے موجود ہزاروں تماشاخیوں نے کھڑے ہو کر برقی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اس کا نام لے لے کر بہت اونچی آواز میں نعرے لگائے اور اس کی کامیابی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں۔ اتنے سارے لوگوں کو اپنے سامنے پا کر ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ اس کی چھاتی پھول کر اور بھی چورسی ہو گئی۔ اس کی رنگوں میں گردش کرتا ہوا خون اتنا تیز ہو گیا جیسے ابھی رگیں چاڑ کر باہر پھوٹ بے لگا۔ زندگی کے تیس سالوں میں پہلی مرتبہ وہ اس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ تمام جسم کا خون سمٹ کر اس کی پیشانی اور گالوں میں جمع ہو گیا تھا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں انہوں نے اتنا بھرپور اور خوبصورت جوان اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ہند ٹریل کھڑکی کی۔ اتر کر چاروں اطراف تماشاخیوں کو جک کر سلام کیا اور دوبارہ ہلٹ پین لی اور ٹریل پر سوار ہو گیا۔ اس نے پہلے پوری سپیڈ سے آگے چل کر مکمل کیا اور دوسرے چکر میں تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرکز کر کے اس نے اتنا نہ ممکن سپیڈ میں ٹریل دوڑائی اور مخصوص ریسمپ سے ایک پُر اعتماد توازن کے ساتھ اس کنارے کی جانب بڑھا جہاں سے اس نے جمپ کر کے بیس کاروں کے اوپر سے گزرنا

تھا۔

ایک جھٹکنے سے اس کی ٹریل کے ٹائروں نے زمین کو چھوڑا اور ممکنہ زاویے سے فضا میں بلند ہوا کہ جمپ کا مطلوبہ فاصلہ طے کر سکے۔ ایک دو تین۔۔۔۔۔ بیس اکیس بانٹیس کاروں کے اوپر سے گزر گیا۔۔۔۔۔ یہاں تک تو اس کے اور لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ جو وہ سمجھتا تھا سبھی لوگ اس کی تائید کرتے تھے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ ہر دو فریقین کے بیانات مختلف تھے۔

لوگ آنکھوں دیکھا احوال یوں بیان کرتے تھے کہ 'تئسیویں کار تک پہنچ کر اس کی ٹریل کا پچھلا پیسہ ونڈا سکرین پر لگا اور چوبیسویں پچیسویں کاروں کی ونڈا سکرین کو توڑنا ہوا ریسمپ اور آخری کار کے درمیانی وقفے میں جا کر پھنس گیا۔ وہ خود ہوا میں تیرتا ہوا گردن کے بل لوہے کے بنے ہوئے ریسمپ پر گرا اور دو قلو بازیاں کھا کر رک گیا اور پھر کبھی نہیں اٹھا۔ ہلکی سی موہوم سی حرکت بھی اس نے نہیں کی۔ تماشا ٹی اٹھ کھڑے ہوئے اور چیختے ہوئے اس کی جانب دوڑے اس غیر متوقع صورتحال میں ان کے زرخڑوں سے ایسی دہشت انگیز آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بہت سے غیر مرئی ہاتھ ایک ہی وقت میں بے شمار لوگوں کا گھد بار بے ہوں۔ لوگوں کے وہاں تک پہنچنے سے قبل ہی ایک ایسبولینس اچانک نمودار ہوئی اور اس کو اگلے چند منٹ میں قریب واقع سی۔ ایم۔ ایچ۔ لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کا بیان یہ تھا کہ نوجوان موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ گرتے ہوئے تمام بوجھ گردن پر پڑا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔'

مگر نوجوان کا بیان اس سے قطعی مختلف تھا۔ بقول اس کے 'اکیسویں، بانٹیسویں کار کے بعد تئسیویں، چوبیسویں اور پچیسویں کار کے اوپر سے گزرنے کے بعد اس کی موٹر بائیک کے دونوں پیسے لوہے کے ریسمپ پر پکے بعد دیگرے اترے اور وہ پورے اعتماد سے بائیک کی سپیڈ آہستہ کرتے ہوئے ریسمپ کے آخری سرے تک گیا۔ اس نے بالکل آغاز کی طرح بائیک کھڑکی کی، عملت اتارا اور چاروں طرف تالیاں

بجائے شور مچاتے تماشا نیوں کو اس نے سلام کیا اور یوں اس نے ایشیاء کا موٹر بانیک جمپ کار یا رڈ قائم کیا۔ بہت زیادہ کرید نے پرالبتہ اس نے ایک شبہ کا شمار کیا شاید آخری دو یا تین کاروں کی چھتوں سے اس کی بانیک کا پچھلے پسینہ ہلکا سا ٹکرایا تھا یا پھر شاید ٹکڑے ٹکڑے بچ گیا تھا۔ اسے شک تھا شاید ایسا ہوا۔ ہو سکتا ہے، شاید ایسا نہیں ہوا تھا۔ بس یہ آخری بات تھی جہاں پر وہ رک جاتا تھا اور لوگ بولتے چلے جاتے تھے۔

مگر اسے اپنی حسیات پر پورا اعتماد تھا اور کئی بار اس نے کہا بھی کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً اسے معلوم ہوتا۔ جب اس کی بانیک ہوا میں تیرتی ہوئی کاروں کے اوپر سے گزر رہی تھی تو ایک ایک لمحہ کا منظر اس کی آنکھوں میں زندہ تھا۔ یہاں تک کہ ہوا میں رڑے ہوئے اس کے لباس سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بھی اس نے سنی تھی اور اس سرسراہٹ کو اپنے کانوں میں محفوظ کیا تھا۔

وہ جینج جینج کر اپنی عظیم الشان کامیابی کا حال لوگوں کو سنانا چاہتا ہے۔ مگر کوئی فرد واحد بھی اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ سب لوگ یہ کہتے ہیں وہ مرچکا ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے مطابق بھی وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ وہ پوری آواز سے چیختا ہے مگر لوگ اس کا نوٹس ہی نہیں لیتے، جیسے انہیں اس کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی۔

اور آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جب پیدا ہوا تھا اور ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا تب سے ایسا ہو رہا تھا۔ اس کی ماں بتاتی ہے۔ کہ چھوٹے سچے لیٹے لیٹے جھولنے سے گر تو پڑتے ہی ہیں اور انہیں چوٹ بھی نہیں آتی مگر وہ جان بوجھ کر جھولنے سے گرتا تھا اور ایک وقت میں کئی کئی مرتبہ گرتا تھا۔ ادھر وہ گرا اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی ماں نے اسے اٹھا کر دوبارہ جھولنے میں ڈال دیا اور ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ادھر سے ہٹی اور وہ دھڑم سے نیچے گرا۔ مگر کبھی بھی اسے چوٹ نہیں آئی۔ وہ زخمی نہیں ہوا اس کی ٹانگ یا بازو وغیرہ نہیں ٹوٹا۔ زیادہ سے زیادہ چوٹ والی

جگہ پر سو جھن ہو جاتی۔ وہ بھی ایک آدھ دن کے لیے اور وہ پھر ویسے ہی ہو جاتا جیسے پہلے ہوتا تھا۔

”بہت چھوٹا سا تھا“ اس کی ماں بتاتی ہے ”شاید پراسری سکول کی کسی جماعت میں، جب اس نے ایک روز اچانک تین پتیوں والی سائیکل کا ایک پتہ اٹھا کر دوپٹیوں پر اسے چلانا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے بارہا منع کرنے کے باوجود بھی وہ وہی کرتا جیسے اس کا دل چاہتا تھا۔ اس معاملے میں بہت ضدی تھا۔ کسی کی نہیں مانتا تھا۔ حتیٰ کہ والد کے کہنے پر بھی کان نہ دھرتا۔ بہت چھوٹا سا تھا جب اس نے والد سے چوری ان کی سائیکل چلانا شروع کر دی تھی۔ دوپٹیوں والی سائیکل کے پیدل تک اس کے پاؤں پہنچنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سائیکل کے فریم میں پاؤں ڈال کر اسے چلاتا تھا۔ شروع سے ہی دھلا پتلا اور لچکدار جسم کا مالک تھا اور اس چیز کا اسے بہت فائدہ رہتا تھا۔ درختوں پر پلک جھپکتے چڑھ جانا اور پھر ٹہنی پکڑ کر ایک درخت سے دوسرے پر حصول جانا اس کی دن بھر کی مصروفیت کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹہنیاں ٹوٹیں، درختوں سے گرا، پتہ نہیں کیسے ہر مرتبہ بچ جاتا تھا اور کوئی شدید چوٹ نہیں آتی تھی۔

بائی سکول پہنچا تو باسکٹ بال اس کا پسندیدہ ترین کھیل ٹھہرا۔ فاصلہ کتنا ہی ہوتا زاویہ کیسا ہی ہوتا، اتنی سہولت سے بال باسکٹ میں پھینکتا تھا۔ کہ تماشائی سانس روکے رکھتے۔ میں نے جتنے میچ دیکھے، مجھے یاد نہیں پر مگر کبھی اس نے بال پھینکا ہو اور وہ خطا ہوا ہو۔ کلچ میں پہنچا تو پہلے سال ہی سالانہ کھیلوں کے موقع پر بانس کی مدد سے بائی جمپ میں اس نے ریکارڈ قائم کیا اور ڈورس کے کالہوں میں آج تک اسے کوئی نہیں توڑ سکا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے جمپ لگاتے دیکھا تھا۔ بالکل مچھلی کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا وہ اتنی بندی سے کود گیا تھا۔ اس وقت کی اس کی تصویر اخباروں میں چھپی تھی میں نے سن تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ وہ پائیلٹ بننا چاہتا تھا۔ ہوا میں اڑنا اس کا خواب تھا جس کی تکمیل وہ کھلی آنکھوں سے چاہتا تھا ایف اے کرنے کے بعد اس نے

دو مرتبہ پائیلٹ بننے کا امتحان دیا۔ مگر دونوں مرتبہ ہی طبی معائنے میں رہ گیا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ بہت سنجایا مگر جیسے ایک مقام پر آکر اس کی سوئی رک سی گئی۔ کسی کی نہیں مانی۔ بس بھوت سوار ہو گیا موٹر سائیکل کو ہوا میں اڑانے کا بھوت۔ دن رات اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ باتیں کرتا رہتا، کتابیں پڑھتا رہتا، شروع شروع میں ہم لوگوں نے اس کی توجہ تعلیم مکمل کرنے کی طرف دلائی مگر بے سود۔ پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ سب لوگوں کے سامنے ہے۔

اتنا کہہ کر اس کی والدہ خاموش ہو گئی اور وہ پھر بول پڑا۔

میں کوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوں۔ بلکہ عام ساجد باقی نوجوان ہوں۔ جو کچھ کر گزرنے کی تمنا دل میں رکھتا ہے۔ بس مجھ میں اور باقی لوگوں میں صرف ایک ضد کا فرق ہے۔ کچھ بھی کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے تو وہ کام سیری ضد بن جاتا ہے۔ جسے کتابوں میں عزم صمیم لکھا گیا ہے۔

ہوا میں اڑنا بھی سیری ضد تھی اور میرے سامنے کوئی بھی مزاحمت کی دیوار نہیں ٹھہر سکی اور میں نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جو میں کرنا چاہتا تھا۔

نوجوان کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد اور چہرے پر بھرپور زندگی کا تاثر تھا۔

میں نوجوان کی والدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پھوٹ کی بہہ رہے تھے۔ دکھ کا احساس مجھے بھی بگڑ گیا۔ گیلی سی آئی - ہندوستان خوشبو نے مجھے چونکا دیا۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے زمین کھود دی ہو۔ اور گیلی مٹی کی ایک دھیری سی بنا دی ہو۔

گیلی مٹی کی دھیری ساری خوشبو میں نے اپنے اندر بھری اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ اس اتنے بڑے ہجوم میں واحد میں ایسا شخص ہوں جسے یہ ایقان حاصل ہو گیا ہے کہ نوجوان سچ کہہ رہا ہے۔

گرین ہاؤس

وہ صبح گزری صبحوں سے کئی حوالوں سے مختلف تھی۔

اس صبح خود ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے یوں لگا میسے بست گھری اور طویل نیند سے بیدار ہوا ہے کہ خود کو بست تازہ دم اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نیند کتنی بڑی نعمت ہے آج پہلی مرتبہ سے اس بات پر یقین آیا تھا۔

اُس کے لیے یہ بات قدرے حیران کن تھی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہو تھا۔ بلکہ بست سالوں کے بعد آج پہلی مرتبہ کسی کے جگائے بغیر اس کی آنکھ صبح وقت پر کھل گئی تھی اور اس نے بیدار ہونے کے چند لمحوں بعد ہی بستر چھوڑ دیا تھا۔ عام طور پر اس کی بیوی دوسری تیسری مرتبہ سکر اسے جگاتی اور وہ خراب مزاج، بوجھل ذہن و رونا کھواری کے احساس کے ساتھ بستر چھوڑتا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ اسی ابھی تو اس کی آنکھ لگی تھی۔ اتنی جلد ہی کیسے صبح ہو گئی۔ بھی تو گزشتہ طویل دن کی تھکاوٹ اس کے بدن میں ہی تھی۔ پہاڑ جیسے دن کی مشقت کا احساس اکثر اسے ہٹکانے لگتا رہتا۔

مگر آج صبح تو کمال ہی ہو گیا۔ اس کی بیوی کچن میں ہی تھی مگر بھی برتنوں کی کھسکناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس سے بھی بہت پیسے ٹٹہ کیا تھا اور بہت تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بستر سے باہر چھلانگ لگائی اور باتھ روم میں کھس گیا۔

نسانے اور شیو بنانے کے بعد وہ قولیہ باتھ میں لیے بالوں کو پونچھتا ہوا جب باہر نکلے تو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پریمی جانے سے اٹھتی گرم گرم بچاپ نے سے مسور کر دیا۔
زندگی کتنی پر لطف ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

جانے باتھ میں لیے وہ لاونج کے اس کونے کی طرف آگیا جہاں ناشتے کی میز پر می
تھی وہ جہاں لگی کچھ کی سے مرکزی صحن (Atrium) میں لگی بیلیں اور اندور پلانٹس
(Indoor Plants) کا براہ راست نظارہ ملتا تھا۔ اس مرکزی صحن میں لاونج کے علاوہ
ڈرائنگ روم اور سٹڈی روم کی کچھ کچیاں بھی کھلتی تھیں۔

زندگی اتنی پرسکون اور سبزہ استا اطمینان بخش بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تجربہ اس کے
لیے بالکل نیا تھا۔

بچے بھی تیار ہو کر ناشتے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اطمینان سے
ناشتہ کیا اتنی دیر میں ان کی سکول بس آگئی۔ ہارن سن کر وہ باہر بھاگے اور گھر میں
صرف وہ اور اس کی بیوی رہ گئے۔

گھر میں مرکزی صحن اور اس میں لگے ہوئے رنگ برنگے پھول اس کی عمر بھر کی
خواہش تھی جو دو سال قبل ہی پوری ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی جو اطمینان آج اسے میسر آیا
وہ اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ گھر کے اس مرکزی صحن کے اوپر والے حصے کو
فائبر گلاس کی دودھیا چادر سے بند کر دیا گیا تھا اور مرکزی صحن میں سورج کی بالواسطہ
شعاعیں تو آسکتی تھیں مگر ہوا کا گزر اس کے اختیار میں تھا۔ سردیوں میں وہ ہوا کی ٹکاسی
کے تمام راستے بند کر دیتا اور یوں مرکزی صحن ایک گرہن بادیں بن جاتا۔

اس کا فائدہ اسے یہ ہوتا تھا کہ دن کے وقت سورج کی شعاعیں مرکزی صحن پر
پریمی چھت کی دودھیا چادر سے اندر داخل ہوتی تھیں اور اس میں جمع شدہ کاربن ڈائی آکسائیڈ
کے باعث درجہ حرارت بہت مناسب سطح پر رہتا اور دسمبر کی شدید سردیوں میں بھی
اس کے پودے اور پھول سبز رہتے۔ کبھی کبھار اگر درجہ حرارت تجاوز کرنے لگتا تو وہ

مرکزی صحن کی وہ کھڑکی جو ٹیرس کی جانب تھی کھول دیتا کچھ دیر کے بعد جب حرارت قدرے کم ہو جاتی تو دوبارہ کھڑکی بند کر دیتا۔ اس کے دوست احباب اس سے ملنے آتے تو سارا سال اس کے ہاں کھلے پھولوں اور سبز پودوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے۔

اس نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور کپ میز پر رکھ دیا اور کچھ دیر کے لیے کرسی کی پشت سے سر ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک مکمل اطمینان اس پر غالب تھا۔ اس کی بیوی نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور بدن کی خوشگوار مہک اس کے ہمراہ کر دی۔ پورچ میں گاڑی گاڑی چمک رہی تھی۔ گونسی نہیں تھی مگر اس طریقے سے صاف کی گئی تھی کہ بالکل تازہ دم لگ رہی تھی۔ اس نے انگنیشن آن کیا اور اگلے لمے میں گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ خاص طور پر سردیوں میں تو انجن کو گرم ہوتے دیر لگ جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے دھکا لگا کر سٹارٹ کرنا پڑتا۔ بیوی کو خدا حافظ کہہ کر وہ سر ہٹ کر آ گیا۔

سر ہٹ کر تمام ٹریفک خلاف معمول بہت قریب سے رواں دواں تھی۔ وحدت روڈ سے جب وہ فیروز پور روڈ پر آیا تب بھی اسے کسی ذہنی تناؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تمام گاڑیاں ایک ہی سپیڈ سے چل رہی تھیں کسی کو دوسرے سے آگے نکل جانے کی جلدی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی بارن پر ہاتھ رکھے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی گاڑی ایسی جگہ کھڑی نظر نہ آئی کہ جس کے باعث ٹریفک کی روانی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوا ہو۔ یا کسی نے راستہ لینے کے لیے جھنجھلا کر بارن بجایا ہو۔ سورج کی شعاعیں بہت روشن اور چمکدار لگ رہی تھیں۔ کناروں پر اُگے درخت زیادہ سرسبز و شاداب لگ رہے تھے۔

ہر روز صبح جب وہ دفتر پہنچتا تھا تو گاڑی کی مناسب جگہ پر پارکنگ ایک مسئلہ ہی ہوتا تھا اور آتے ہوئے وہ دل میں یہی دعا مانگ رہا ہوتا کہ یا خدا اس مسئلے سے بچا۔ مگر

پھر بھی زیادہ دنوں میں ایسے ہی ہوتا تھا۔ کہ وہ ادھر ادھر جہاں جگہ ملتی گاڑی کھڑی کر دیتا اور چابی چوکیدار کے حوالے کر آتا۔ وہ بعد میں کوئی مناسب جگہ ملنے پر گاڑی پارک کر کے چابی اسے دے جایا کرتا تھا۔ مگر آج تو تمام گاڑیاں ایک ترتیب سے کھڑی تھیں اور ابھی مزید بہت جگہ باقی تھی۔ اس ترتیب اور قرینے نے جگہ کو کتنا کشادہ کر دیا تھا۔ اس نے اٹمینان سے گاڑی اس ترتیب میں کھڑی کی۔ بریف کیس اٹھایا اور چابی ہوا میں لہرتا، گنگناتا ہوا کمرے کی جانب چل پڑا۔

اپنی میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ وہ سمجھا شاید نائب قاصد تبدیل ہو گیا ہے اور نیا نائب قاصد یہ پھول لے کر آیا ہے کیونکہ پرانے والے سے تو اسے توقع ہی نہیں تھی۔ اسے سیٹ پر بیٹھنے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ نائب قاصد اس کے لیے پانی کا گلاس لے کر حاضر ہوا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ دھتے دھلنے اور استری کیے ہوئے کپڑوں میں بہت بستر لگ رہا تھا۔

بڑے صاحب کے پی اے نے انٹرکام پر بتایا کہ بڑے صاحب یاد فرما رہے ہیں وہ نوٹ بک پن اور آج کے دن کی Assignment سے متعلقہ ضروری کاغذات لے کر حاضر ہو گیا۔ انہوں نے بڑی شفقت آمیز محبت سے حال پوچھا۔ بیٹھنے کے لیے کہا اور آج کے ضروری معاملات کی باتیں کیں۔ بڑے صاحب کے کمرے سے نکلا تو اسے اپنی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جانے کے سبب توانائیاں بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

گیارہ بجے تک ہی اس نے آج کی ضروری فائلیں نمٹا دی تھیں۔ کوئی بھی فائل کھولنا ایک نظر دیکھتے ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا اور پھر اس کا قلم چلنے لگتا۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا کتنے کتنے دن گزر جاتے تھے مگر وہ فائل کھولتا ہی نہیں تھا پتہ نہیں اسے کیوں یقین ہوتا کہ وہ کیس کو سمجھ ہی نہیں سکے گا اور لوگ بھی تو عجیب طرح کے مسائل لے کر آ جاتے تھے۔ مگر آج جب گیارہ بجے والی چائے آئی تو وہ تمام ضروری معاملات

نمٹا چکا تھا۔

دفتری معاملات میں الجھا ہونے کی وجہ سے اگر کوئی دوست دفتر آ جاتا تو وہ خالی الذہن ہو کر اسے مل ہی نہیں پاتا تھا اور اسی وجہ سے اس کے احباب کی تعداد گھٹتے گھٹتے چند ایک رہ گئی تھی۔ آج ناصر ملنے آیا تو اس نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اسے گلے لگایا بٹھایا۔ حال احوال پوچھا کتنے مہینوں بعد تو وہ آیا تھا۔ پرانی یادوں کا سلسلہ چل نکلا اور مہینوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے دونوں آج کے لمحات میں حاضر و ناظر بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

واپسی پر دفتر سے نکلا تو بھی اسے گاڑی ٹکانے میں دقت پیش نہیں آئی شیرازی صاحب سرک کے کنارے پیدل چلتے ہوئے نظر آئے تو بریک لگا دی۔ وہ یقیناً بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا آئیے ناں شیرازی صاحب بیٹھے آپ کا گھر میرے راستے میں ہی تو آتا ہے۔ میں ڈراپ کر دوں گا۔

شیرازی صاحب کو ایک لمحے کے لیے تو یقین نہ آیا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت مگر جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکے گاڑی چل پڑی تو انہیں یقین کرنا پڑا۔ وہ اس خدمت معمول تبدیلی پر غور کرنے لگے گھر تو پچھلے کئی برسوں سے میرا راستہ میں ہی تھا اور شروع میں تو مجھے ساتھ بھی لے لیتے تھے۔ پھر پتہ نہیں کب کسی ناگوار رد عمل کے احساس کے بعد مجھے ساتھ لینا چھوڑ دیا تھا۔

اب جو کچھ پہنچا تو بیوی کی آنکھیں کھڑکی سے لگی راستہ دیکھتی ہوئی ملیں۔ گاڑی لک کر رہا تھا سب سے چھوٹے بیٹے نے بانہیں پھیلا دیں۔ آہا پاپا آگئے۔۔۔۔۔ پاپا آگئے۔ بیوی نے بریف کیس پکڑا اور اندر داخل ہو گئے۔

اپنا گھر اسے خوشیوں کا گھوارہ لگا۔ اپنی چست اسے اطمینان کی ضمانت نظر آئی۔ ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ روم سے نکلا تو سب ڈسٹنگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بیوی نے ڈونگے سے دھکن اٹھایا۔ گرم گرم بھاپ نکلی تو یوں لگا جیسے کسی جن کا ہیولہ بنا

جو اور کھد رہا ہو "حکم میرے آکا----- دنیا کی اور کوئی نعمت آپ کے قدموں میں
ڈھیر کر دوں"

بیوی کے ہاتھوں پر نظر پڑی تو اسے احساس ہوا کتنے برسوں کے نقشِ جم کر رہ گئے ہیں۔ اس نے پیار سے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ اپنی طرف متوجہ پا کر ایک عجیب سی کیفیت میں چلی گئی۔ جیسے بہت سالوں بعد کسی مرد نے اسے بھرپور توجہ سے دیکھا ہو۔ وہ تو توجہ بھری آنکھوں کی حدت کی لذت ہی بھول گئی تھی۔

ہم کتنے برسوں سے دوا جنبیوں کی طرف ایک ہی چھت تلے رہ رہے تھے۔ اسے پہلے کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے تمام تر کوشش کے باوجود بھی یاد نہ آیا کہ وہ آخری مرتبہ کب بیوی بچوں کو لے کر گھر سے باہر نکلا تھا۔ وقت ہی میسر نہ آتا تھا۔ دفتر میں جوف ٹکس بچ رہتی تھیں وہ انہیں ساتھ گھر لے آتا اور پھر رات گئے تک ان پر نوٹ لکھتا رہتا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے چھوٹے بیٹے کو گود میں بٹھا کر ڈھیر سارا پیار کر ڈالا۔ اس کی کھلکھلاہٹ نے گھر میں زندگی کی لہر دوڑادی تھی۔

وہی زندگی جس کے ارد گرد کثافتوں سے آلودہ ہوا لپٹی ہوئی تھی۔ اور وقت کا سورج اپنی شعاعیں پھینک کر اسے اور بھی حدت انگیز کر رہا تھا۔ اس کے گرد صرف کاربن ڈائی آکسائیڈ نہیں تھی۔ اور بھی بے شمار غلطیوں اور آلودگیاں تھیں۔ جو سورج کی شعاعوں کو اپنے اندر ٹرپ (Trap) کر لیتی تھیں اور اس کا وجود جلتے ہوئے صحرا کی طرح دبکنے لگتا مگر اس کے ٹیرس پر کوئی کھڑکی نہ تھی۔ کہ جسے وہ حسب ضرورت کھول کر ان آلودہ ہواؤں کا اخراج کر سکتا۔ تاکہ کم سے کم حرارت Trap ہوئی۔ اس کے ہاں تو بس عمل اور رد عمل کا فلسفہ تھا اور اسے اس نے تب سے قبول کر لیا ہوا تھا جب سے اس نے نیوٹن کا یہ اصول پڑھا تھا "ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے یہ عمل اور رد عمل باہم برابر لیکن مخالف سمتوں میں ہوتے ہیں۔"

انہی محالیت سمستوں میں سفر کرتے ہوئے اس نے زندگی گزار دی تھی۔ اس سے زیادہ زندگی کا مضمون اس پر واضح ہی نہیں ہوا تھا۔ دفتر میں گھر، باہر، جہاں بھی جوتا یہ فلسفہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ مگر اس فلسفے کے نتائج میں سوائے شدید اعصابی تھکاوٹ کے اور کچھ بھی اس کے ہاتھ نہ آیا۔

اسے گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ گھر، دفتر، لوگ، رشتہ دار، ٹرینک، بازاروں کا جھوم، مسکائی، خود غرضی، مناقشت، لگے کوکاندھامار کر اس سے آگے گزر جانے کی خواہش، خود کو دوسروں سے بستر اور برتر ثابت کرنے کی انسٹک دوڑ، شہر کی کھم آباد سڑکوں پر لوٹ مار کی وارداتیں، پاؤں سے بھم باندھ کر سرمایہ ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کروانے کے واقعات، چند روپوں اور جموٹی انا کے لیے گلہ کاٹنے اور گولیوں سے چھلنی کر دینے کی باتیں اور معلوم نہیں اسے کیا کیا کچھ یاد آتا گیا۔ اسے اپنی سانس بند ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی جیسے کوئی اس کا گودہانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے زخروں سے عجیب و غریب آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ ان آہنی شکنجوں سے خود کو بچانے کی کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اپنے ہی لگے سے نکلتی ہوئی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اعصاب بری طرح کانپ رہے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے کمرے میں دیکھا مگر خود کو تنہا پا کر ایک عجیب سے خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی سو رہی تھی۔ مگر وہ بالکل اجنبیوں کی طرح اس سے بھی خوف زدہ ہو گیا سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے جگ سے اس نے گلاس بھر اور غٹا غٹ پی گیا۔ ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھے اور تنفس قدرے بحال ہوا تو اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ اذان ہو رہی تھی۔ الصلوٰۃ خیر من النوم

سرک کے کنارے

پچھلے کئی دنوں سے مسلسل ایک خواب اسے پریشان کیے ہوئے ہے۔ ایک ہی خواب کا بار بار دکھائی دینا اس قیاس کو تقویت دیتا ہے کہ ایسا ہی یا پھر اس سے ملتا جلتا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

خواب کی نوعیت تو بہت سادہ ہے وہ چشیرنگ کر اس سے ریگل کی جانب جا رہا ہے۔ تقریباً نصف میں پہنچ کر، پینوراما کے بالکل سامنے اسے ایک بچہ نظر آتا ہے جو فٹ پاتھ سے اتر کر شاہراہ قائد اعظم پر اس انداز سے کھڑا ہے۔ کہ جیسے گاڑیوں کی قطار ٹوٹنے کا منتظر ہو، تاکہ سرک پار کر سکے۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب کا وقت ہے۔ سبھی لوگ اپنے اپنے دفتر پہنچنے کی جلدی میں ہیں۔ وہ بھی اس جلدی میں خاصی رفتار سے گاڑی چلا رہا ہے مگر پھر بھی اسے دور سے وہ بچہ نظر آ جاتا ہے۔ پہلی نظر دیکھنے پر ہی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرک پار کرنا چاہتا ہے۔ یہاں کوئی زیبرا کراسنگ نہیں ہے۔ ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ گاڑیوں پر سوار ممکنہ تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے لوگ اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور گزرتے جاتے ہیں۔

مگر اُس نے اسے دور سے دیکھ لیا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اسے رکنا

کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ معمول کی رفتار سے گاڑی چل رہا تھا۔ کہ جب اچانک اس کی نظر پڑی تو اسے شاہراہ قائد اعظم کے کنارے فٹ پاتھ پر پینوراما کے سامنے وہ میلے کھیلے کپڑوں والا بچہ کھڑا نظر آیا۔ مگر جتنی دیر میں اس نے بیک مرر میں پیچھے اور پھر سامنے دیکھا اور بیک پر دباؤ بڑھانے کا ارادہ کیا وہ عین اس لمحے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

اپنے پیچھے گاڑیوں کا ہجوم دیکھ کر اس نے فوری طور پر اپنا پاؤں کھینچ لیا اور گاڑی کو اسی رفتار سے آگے بڑھنے دیا اور وہ اس سڑک کے سامنے سے گزرتا ہی چلا گیا ریگل چوک کا اشارہ بند تھا۔ سو اس کو رکنا پڑا۔ اس نے بیک مرر میں اس لڑکے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر آئینے میں سوائے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آسکا۔

دفتر پہنچا تو طبیعت بہت بوجھل تھی۔ عجیب سی بے زاری اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ زیادہ الجھن اس وجہ سے تھی کہ معلوم ہونے اور جاننے کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر سکا جیسے اس کا پہلے سے کیا ہوا فیصلہ تھا۔ اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے کسی اور کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ کوئی اور اس راہ میں حائل بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی ویسا ہی ہو گیا تھا جیسا وہ گزشتہ کئی دنوں سے خواب میں دیکھ رہا تھا۔

دس گیارہ سال کی عمر کے میلے کھیلے کپڑوں والے اس لڑکے کا تین اسی جگہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اس طرح مل جانا اس کے لیے حیران کن تھا۔ دفتر میں بیٹھا وہ عجیب انداز سے اس واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک نہ تو اپنے خواب کا اور نہ ہی آج صبح کے واقعہ کا کسی سے تذکرہ کیا تھا اس کی سوچ کا دھاگا الجھتا ہی جا رہا تھا۔

یہ لڑکا سرخ پار کر کے کہاں جانا چاہتا تھا۔ سامنے تو پینوراما شاپنگ سنٹر تھا۔ جہاں ابھی تک دکانیں کھلی نہیں تھیں۔ ویسے بھی اس عمر کے لڑکے کا کسی دکان پر سیلزمین کے طور پر کام کرنا بعید از قیاس تھا۔ تو کیا کوئی صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ بظاہر ایسا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کہ ابھی اس کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ یہ کام بہ احسن طریقہ سرانجام دیتا۔

نہیں کہا؟

تو کیا میں اپنے آپ سے اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا؟

اسٹنٹ کو بات سمجھ نہیں آئی۔ اور وہ دوبارہ بولا۔۔۔۔۔ سر، میرے بچے کو اسکول دیر ہو رہی تھی۔ میں اسے اسکول چھوڑنے چلا گیا بس نکل گئی تھی۔ اس لیے مجھے بھی دیر ہو گئی، معافی چاہتا ہوں۔

ہاں ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ٹریفک بھی تو بہت زیادہ ہے ناں ظاہر ہے سرک پار کرنے کے لیے بھی کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ گاڑیوں کی قطار ہی نہیں ٹوٹتی۔

مجھے اجازت ہے سر۔۔۔۔۔ اسٹنٹ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا سارا دن وہ اسی طرح کے خیالات میں کھویا رہا۔ معلوم نہیں سویا رہا کہ جاگتا رہا، بس دھیان آ جا کر اس بچے پر ٹک جاتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے سرک پار کر لی ہو گی یا نہیں۔ کہیں وہ ابھی تک وہیں نہ کھڑا ہو؟ کہیں وہ گاڑیوں کی قطار ٹوٹنے سے ناامید ہو کر واپس نہ چلا گیا ہو۔ یا پھر کہیں جلدی میں وہ کسی گاڑی کے نیچے نہ آ گیا ہو۔۔۔۔۔

اس خیال کے آتے ہی اس کا پورا بدن پسینے میں نہا گیا۔ دن میں کئی بار اسے یہ خیال آیا اور کئی بار اس کا بدن پسینے میں شرابور ہوا۔ ماتھے پر قطرے چمکنے لگے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ چل کے دیکھ آئے۔ شاید تب ہی اطمینان کی کوئی صورت بنے۔

مگر اس کی ٹانگیں اتنی بے جان ہو چکی تھیں کہ وہ محض ایسا سوچ سکا۔ عملی طور پر ایسا کر نہ سکا۔ ایک انجانا سا خوف اسے اس سے روکے ہوئے تھا۔

دفتر سے واپسی پر وہ خاصی کم رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جوں جوں پینورا، شاپنگ سنٹر نزدیک آ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کیا معلوم وہ بھی وہیں کھڑا ہو؟ دور سے اسے اس جگہ پر لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ کب اس نے گاڑی کھڑی کی کب وہ گاڑی سے باہر نکلا اور تقریباً دو بیٹا ہوا ہجوم

کو چیرتا ہوا اس کے عین مرکز میں پہنچا جہاں ایک موٹر سائیکل سوار گرا پڑا تھا۔ اور اس کے بازو سے خون رِس رہا تھا۔ موٹر سائیکل کا اگلا پینہ ٹیڑھا ہو کر تقریباً ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔

وہ وہ نہیں تھا، اتنا اطمینان کر لینے کے بعد اس کی سانس کی رفتار نارمل ہونے لگی۔ تو اسے معلوم ہوا کہ ایک بچے کو جو کہ سرکل عبور کر رہا تھا۔ انتہائی تیز رفتاری میں بریک لگاتے ہوئے موٹر سائیکل سوار اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔

بچہ بھی وہیں کھڑا تھا، مگر یہ بچہ وہ نہیں تھا۔ یہ تو صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کسی خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اور اطمینان سے چیونگم چبا رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔
گھر میں بھی وہ رات گئے تک کھویا کھویا رہا۔ اس کی بیوی نے دو ایک مرتبہ اسے کریدا بھی مگر وہ ٹال مٹول کر گیا۔

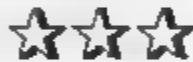
اگلی صبح وہ بیدار ہوا۔ اس نے ناشتہ کیا اور وقت سے ذرا پہلے ہی دفتر روانہ ہو گیا۔ گاڑی کی رفتار خاصی محدل تھی۔ چسیرنگ کر اس گزرنے کے بعد اس نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ مگر وہ بچہ کہیں نظر نہ آیا۔ پس منظر میں صرف دکانیں تھیں جو ابھی بند پڑی تھیں۔ پینورا اسٹر کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی کی رفتار خاصی سُست کر لی۔ مگر وہاں کوئی تعابی نہیں کہ جسے سرکل پار کرنا ہوتی۔ واپسی پر بھی ایسا ہی ہوا۔

پچہ کئی دن اور کئی مہینے بلکہ کئی سال گزر گئے۔ اسے وہ میلے کھیلے کپڑوں میں ملبوس دس گیارہ سال کا بچہ نظر نہ آیا۔ مگر ایک مستقل خلش اس تمام عرصہ میں اس کے ہمراہ رہی۔ اسے وہ خواب تو دوبارہ نظر نہ آیا مگر اس کا خیال ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ موجزن رہا، جو مستقل طور پر اضطراب اور بے چینی کی وجہ بنا رہا۔

اور پچہ کئی سالوں کے بعد اسی جگہ سے گزرتے ہوئے اسے ایک بیس یا تیس سالہ

نوجوان نظر آیا۔ جو پینوراما سٹر کے سامنے، شاہراہ قائد اعظم پر فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر کھڑا تھا اور گاڑیوں کا قطار ٹوٹنے کا منتظر تھا۔ اس نے دور سے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بریک پر دباؤ ہلکا ہلکا بڑھانا شروع کر دیا۔ اور عین اس جگہ سے ذرا پہلے کا یہی کھمٹی کر دی۔ کہ نوجوان سڑک پار کر سکے۔ نوجوان نے سڑک پار کر لی۔ تو اس نے اطمینان سے ایکسپریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا جس نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کی برسوں کی خلش جیسے دور ہو گئی تھی۔ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ کئی برس پہلے دس گیارہ سال کا جو بچہ میلے کھیلے کپڑے پہنے پینوراما سٹر کے سامنے سڑک پار کرنا چاہتا تھا وہ یہی نوجوان تھا۔

(۱۶ - اگست ۱۹۹۴ء)



گلاس وال

اخبار کے نیوز سیکٹر کے جس گلاس کیبن میں وہ بیٹھا ہے مٹی سٹوری بلڈنگ کے پانچویں فلور پر واقع ہے اور اس کیبن کے تین اطراف گلاس وال ہے جبکہ چوتھی سمت ایک بڑی کھڑکی کھلتی ہے جس میں دور دور تک شہر کے مختلف علاقے نظر آتے ہیں۔ دو دو چار چار منزلوں پر مشتمل گھرؤں سے لے کر کئی کئی کنال کے بنگلوں کے علاوہ کثیر منزلہ عمارتیں حد تک کھڑکی نظر آتی ہیں۔ دن کو تو کوئی خاص منظر نہیں ہوتا البتہ رات کو روشنیوں میں لپٹی عمارتیں عجیب طرح کے احساسات لیے ہوتی ہیں۔

گلاس وال کے اس کیبن سے نیوز سیکشن کے دوسرے کیبنوں کے علاوہ نیوز ہال میں کام کرتے ہوئے کمپیوٹر روبوٹ بھی دیکھے جاسکتے ہیں وہ ان انسانوں کو روبوٹ اس لیے کہتا تھا کہ اسے کبھی ان کے چہروں پر کوئی خوشی، غمی، افسردگی، جوش۔۔۔ کوئی تاثر نظر نہیں آیا بڑی سے بڑی خبر ہو سبھی اپنے کام میں موزون رہتے ہیں کسی قسم کے جذباتی رد عمل سے بے نیاز ہر لمحہ مصروف کار نظر آنے والے انسانوں کو وہ روبوٹ نہ کہتا تو کیا کہتا۔

اس کے کیبن میں ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔ مسلسل آواز۔۔۔ خبریں۔۔۔ وہ خبریں جو دوسرے شہروں سے آتی تھیں۔ خود بخود ٹائپ ہو کر پیپر پر منتقل ہوتی

رہتی تھیں اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ان خود کار ٹائپ رائٹروں سے نکلے ہوئے کاغذ اکٹھے کرتا اور پھر انہیں متعلقہ سیکشن میں بھیج دیتا، کم و بیش یہی اس کی ذمہ داری تھی اور شاید اسی وجہ سے اسے کچھ لمبے میسر آ جاتے اور وہ کبھی کھڑکی سے باہر سونے ہوئے شہر کو دیکھ لیتا، اور کبھی اس کی نگاہ کمپیوٹر ڈسک پر مصروف روبوٹس پر پڑ جاتی اور کوئی نہ کوئی خیال، یاد رہ جانے والی کوئی بات سرک کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہرا جاتی اور اس طرح وقت گزرتا رہتا۔

نیوز سیکشن کے ان گیبنٹوں کا مقصد یہی تھا کہ بصری رابطہ رہے مگر سمعی تعلق قائم نہ ہو۔ تاکہ کسی بھی روبوٹ کی پراگرس پر اثر نہ پڑے۔ مگر کئی سالوں سے اسی طرح کام کرنے والوں کی عجیب طرح کی سائیکی بن گئی تھی۔ بعض اوقات تو اسے جذبات سے عاری چہروں سے وحشت ہونے لگتی مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ نیوز سیکشن میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس نے خود کار ٹائپ رائٹر سے نکلنے والے کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر ابھی ایک طرف رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر کمپیوٹر تین کے روبوٹ پر پڑی۔ وہ خاصی تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کسی شدید ذہنی تناؤ کی عکاسی کر رہے تھے اچانک اس کی چیخ ابھری، مگر اس کے ہنس پاس بیٹھے دیگر روبوٹس نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ جیسے ان کا باہمی سمعی رابطہ قائم ہی نہ ہو، یا پھر جیسے ہر کوئی اپنی مصروفیت کی دلدل میں سر سے پاؤں تک دھنسا ہوا ہے ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کوئی آواز سننا ناممکن سی بات ہوگی۔ کمپیوٹر تین کا روبوٹ چیخا۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ یہ ممکن ہی نہیں۔۔۔۔۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شام جب وہ آفس آ رہا تھا، تو بازار اسی طرح بارونق اور لوگ حسب معمول خریداری میں مصروف تھے۔۔۔۔۔ پرجوش نوجوان، خوش چہرے۔۔۔۔۔ مصروف خواتین۔۔۔۔۔ قائل کرتے ہوئے زوکاندار۔۔۔۔۔ سب کچھ ویسے ہی تھا اور وہ وہی بھلے والا۔۔۔۔۔ آج تو بہت ہی

رٹش تھا اس کے پاس۔۔۔ گاڑیوں کی قطاریں بھی ویسی ہی تھیں۔۔۔ اندر کھلی بازار میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دیکھا تھا کہ اسٹیشنری سٹور پر بھی معمول کے مطابق رٹش تھا، مگر اس خبر کے مطابق ٹھیک چارج کر بیچین منٹ پر دھماکہ ہوا تھا، بم کسی خالی ڈبے میں رکھا گیا تھا۔ یعنی اس کے آنے سے صرف بارہ منٹ بعد۔۔۔ اور اب سرنگ پر بسنے والا خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ بم دھماکے میں لوگوں کے اڑ جانے والے پیتھڑے اکٹھے کیے جا رہے تھے۔ کئی ایک ایسے تھے جن کے جسم کے اعضا پورے نہیں مل رہے تھے، کئی ایک کی شناخت ناممکن ہو رہی تھی چند ایک ایسے بھی تھے جو بال باں بچ گئے تھے، اور انہوں نے آنکھوں دیکھی صورت حال بیان کی تھی۔

کمپیوٹر تین کے روبروٹ نے ساری خبر با آواز بلند پڑھنا شروع کر دی۔۔۔ مگر یہ کیا کسی نے بھی تو توجہ نہیں دی۔ جیسے سب بہرے ہوں۔

گلاس کیبن میں بیٹا وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے کافی ضبط کیا۔ مگر نہ روکا اور گلاس کیبن سے باہر نکل آیا، وہ کمپیوٹر تین کے آپریٹر کی طرف بڑھنے لگا، قریب پہنچ کر اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں تو مسلسل خاموشی اور چپ کاراج تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اسے اپنے کانوں میں گونجتی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں، شور بڑھتا جا رہا تھا، وہ کوئی بات کیے بغیر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ وہی ایک ہی آواز۔۔۔ کان جس کو سن سن کر عادی ہو گئے تھے اور اب تو جیسے اعصاب میں تناؤ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ ٹک ٹک اب بند ہوئی کہ اب بند ہوئی۔۔۔ اور اس انتظار میں اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوتے رہتے تھے مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ آواز آتی رہے تو وقت کے گزرنے کا احساس ہوتا رہتا تھا اپنے بیداروں میں مائٹم پیس کی ٹک ٹک میں بھی اسے یہی ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی تھی۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، شہر پر سکون نیند کی حالت میں تھا۔ شام ہونے والے دھماکے کا کہیں احساس تک نہیں تھا۔ اسے خود اس حقیقت پر شائبہ ہونے لگا۔۔۔ ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔۔۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا اسے یقین ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے صبح بیدار ہونے والے اخبار میں اس دھماکے کی تفصیل پڑھیں گے تو وہ نہیں مانیں گے اور اخبار کے جھوٹا ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ چشم دید گواہ بھی اتنے سہم چکے ہوں گے کہ ان کی یادداشت ان کا ساتھ چھوڑ دے گی اور ویسے بھی ایک آن دیکھا آن چھو خوفِ خود انہیں اس طرح کی گفتگو سے روکے گا۔

مگر کاغذ پر لکھ دیئے جانے والے حروف آنے والے وقت کا سب سے بڑا سچ بن کر زندہ رہتے ہیں اور یہی یقین تھا۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی کی بے معنویت کا شکار نہ ہوتا تھا اور یہ نوکری جاری رکھے ہوئے تھا۔

کمپیوٹر سات کے روبوٹ نے ایک بھر پور انگریزی لی، سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی تعداد کو گنا، کام کا اندازہ کر لینے کے بعد اس نے گھر میں کی طرف دیکھا اور اس کی انگلیاں کی بورڈ پر اور بھی تیزی سے چلنے لگیں۔۔۔ ایک فائدہ ان کے سات افراد کی اجتماعی خود کشی۔۔۔ تفصیلات کے مطابق ایک تنگ دست شخص نے بیمار بیوی، مفلوج ماں اور یرقان زدہ بچوں سمیت خود کشی کر لی اور بہتہ اس وقت چلا جب ہمسائیوں کے گھر میں تعفن زدہ لاشوں کی بو گھس آئی۔

روبوٹ کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسوؤں نے سامنے پڑے کاغذات کو بگودیا۔ لفظ پھیلنے لگے، لفظ جو لکھے جانے کے بعد بھی ہمیشہ رہ جانے والے سچ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، نسیم پانی کے سامنے اپنا شخص قائم نہ کر سکے، اور پھیلنے لگے۔

وہ گدس کیہن سے باہر نکل آیا مگر سیدھا کمپیوٹر سات کے روبوٹ کی جانب نہیں گیا اس حالت میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے مقابل نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ رونے والوں کے ساتھ وہ بھی رو دینے والوں میں سے تھا اور یہی بات اس

کے لیے بزدلی کا ٹائٹل ملنے کا سبب بنی تھی مگر اس کا ایمان تھا کہ رونے والے دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر جب کمپیوٹر سات کے روبوٹ کے پاس پہنچا۔ تو وہ حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی مگر کمپیوٹر سات کا روبوٹ اس کی آواز نہ سن سکا۔ اسی لیے تو اس کے بات کرنے کے بعد بھی روبوٹ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا تھا۔ اسے پھر شائبہ ہو گیا۔ شاید گلاس کیبن سے اس نے غلط نہ زہ لٹا لیا تھا۔ یہاں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

وہ پلٹا تو اس کی نظر کمپیوٹر پانچ کے روبوٹ کی خالی کرسی پر پڑی تو اسے یاد آیا۔۔۔ کمپیوٹر پانچ کا روبوٹ ابھی نہیں آیا تھا۔ البتہ کچھ دیر پہلے اس کی اطلاع آئی تھی کہ اگر وہ دس بجے تک آئیے تو ٹھیک وگرنہ وہ نہیں آ سکے گا اور اس کی چھٹی کی درخواست منظور کر لی جائے جو اس نے اپنے دراز میں رکھ چھوڑی تھی۔

کمپیوٹر پانچ کا روبوٹ مال ہی میں شادی کے بندھن میں باندھا گیا تھا تب سے اس کی توجہ کام پر کھم اور منکوحہ کی باتیں بیان کرنے پر زیادہ صرف ہونے لگی تھی۔ اس بات کو محسوس تو سب نے کیا تھا مگر کسی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

شادی کے پہلے ایک مہینے تک تو وہ اپنی منکوحہ کی خوبسورتی اور اچھائیوں کے قصے بیان کر کے خود کو یقین دلاتا رہا اسے براہِ علم یہ تھا کہ وہ محبوبہ جس کے لیے اس نے کتنی ہی غڑغڑاتوں سے برطانیہ قبول کی تھی اور جب وقت آیا تھا تو اس نے اپنی قریبی رشتہ دار بچپن کی منگیترا سے شادی کر لی تھی گاؤں سے شہر آ کر اور خصوصاً صحافت سے وابستہ ہو کر اس کے بست سے اظہار بدل گئے تھے مگر ایک چیز نہ بدلی تھی۔ اور وہ اس کا اندر تھا۔ اس نے آنکھوں سے کچھ اندر اترنے دیا ہوتا تو مشکل تبدیلی آتی یہ اس کا ہی حال نہ تھا یہاں سب روبوٹس ہی ایسے تھے۔ تبدیلیوں کو ظاہری سطح پر قبول کرنے والے۔ تو پھر ایسے لوگوں کے الفاظ میں اثر پذیر می کہاں سے آئے انقبض کہاں سے

اُٹھے۔

وہ یہ سب سوچتا ہوا دوبارہ گلاس کیہیں میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خود کار ٹائپ
رٹر سے لکھی جانے والی خسروں والے کاغذات کا بندل باندھا اور نیوز سیکشن کے
متعلقہ روبوٹ کو بھجوا دیا۔ ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک چل رہی تھی مگر آن تو جیسے اس کے
اند ر کی سوئی کہیں ابک گئی تھی وقت گزر رہا تھا۔۔۔ ٹک۔۔۔ ٹک۔۔۔ مگر گھر ملی کی
سونیاں جیسے ایک بند سے پر ٹھہر گئیں تھیں۔

اس نے پائے مسکونی، گرم گرم پانی کے دو تین گھونٹ حل سے نیچے اترے
تو اس نے سٹول پر بیٹھ کر کمر پیچھے ہٹا دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کان تو کھلے ہوئے
تھے سن رہے تھے ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک

اس کا دھیان چار چار کنال کے بڑے بڑے بنگلوں کی طرف چلا گیا۔ جن کے
فرنٹ لون بھی بڑے ہوتے ہیں اور ان میں اگنے والی گھاس بھی زیادہ سرسبز و شاداب
ہوتی ہے۔ بالکل خمیلیں فرش کی طرح بھیجی ہوئی گھاس۔۔۔ اس نے صرف اخبار میں شائع
ہوئے ولی کہانیوں میں اس کا تذکرہ پڑھا تھا۔ پتہ نہیں کب؟۔۔۔ وہ چونک اٹھا۔۔۔
شاید کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کمپیوٹر چار کا روبوٹ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا قدرت
کی طرف سے ہونے والی یہ نا انصافی قطعی ناقابل برداشت ہے۔ یہ تنگ و تاریک گھروں
میں رہنے والے بمشکل تمام زمیں پر لیٹنے کے لیے جگہ تلاش کر پاتے ہیں اور تنے بڑے
بڑے بنگلوں میں رہے والے سامانِ آرائش سے بڑے بڑے کمرے بھر لیتے ہیں کہ گھر
خالی نہ لگے مگر گھروں کی زندگی تو انسانوں سے مشروط ہے بے جان شیا انسانوں کی کمی
پوری نہیں کر سکتی۔۔۔ اے خدا یہ ظلم ہے بڑے بڑے لافوں میں دھوپ بھی زیادہ
چمکتی ہے جبکہ ہمارے تنگ و تاریک مکانوں کی چھتوں اور صموں کے حصے میں دھوپ
بھی کم آتی ہے۔۔۔ کمپیوٹر چار کے روبوٹ کی چیخ آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی حتیٰ کہ
وہ بالکل لگا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھڑکیں سے باہر نکلا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ کمپیوٹر ہار کا روبوٹ اپنے سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے کام میں جتا ہوا ہے اور گروپیش سے بے نیاز۔۔۔ اپنی نکلیں کی بورڈ پر چد رہا ہے۔

”تو کیا یہ بھی میرا وہم تھا۔۔۔“ وہ کھڑکیں کیوں کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے، ڈور کھولنے سے دروازہ خود ہی بند ہو جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر اس کا نیوز سیکشن میں بیٹھے روبوٹس سے بصری رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور سمعی تعلق ختم ہو جاتا ہے اس کے کانوں میں ٹک ٹک۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔ مسلسل آتی ہوئی آواز۔۔۔

وہ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے۔ پانچویں فلور سے سولے ہوئے شہر کی مختلف طرز کی عمارتیں کچھ روشنی میں کچھ اندھیرے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ کچھ دیر کے لیے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد۔۔۔ خود کار ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک۔۔۔ بند ہو جاتی ہے۔ وہ آنکھیں کھول دیتا ہے کھڑکیوں کی دوسری طرف کام کرنے والے روبوٹس نے اپنے ہاتھ روک دیئے ہیں۔ کمپیوٹر روم میں ہلکی چلکی حرکت پیدا ہو گئی ہے جیسے آہستہ آہستہ زندگی واپس لوٹ رہی ہو۔

کارٹی تیار ہے۔۔۔ ڈرائیور آخری ہارن بجاتا ہے۔ اس سے قبل سب روبوٹس کارٹی میں بیٹھ چکے ہیں اور وہ بھی ایک طرف کونے میں بیٹھا اونگھ رہا ہے پتو پھوٹنے سے ذرا دور پہلے کا وقت ہے سڑکوں پر زندگی کے شہر پیدا ہو چکے ہیں شہر بیدار ہو رہا ہے۔۔۔ وہ سوچتا ہے۔۔۔ گروہ نیند کی آغوش میں ترستے جا رہے ہیں لمحہ بہ لمحہ۔۔۔ دم بہ دم۔۔۔ جہاں نہ تو ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے، اور نہ ہی روبوٹس نظر آتے ہیں نہ کھڑکیوں کی طرف۔ البتہ ایک کھڑکی ہے جو بہت سے لوگوں کی طرف کھلتی ہے۔ جہاں سبزے کا ٹھہلکاؤ فزیشن پر بچھا ہوا ہے۔ ہاتھ بدلتے ہوئے اپنی طرف بلائے ہوئے ہرے اشجار ہیں۔ جو ہوا پہلے تو جھول جھولتے ہیں نہ پہلے تو ساکن

رہتے ہیں جو خزاں میں تھی دست ہو جاتے ہیں۔ بہار میں پُربہار ہوتے ہیں۔ جہاں
زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ موسم ہوتی ہے، سنائی دیتی ہے۔ جہاں لکھے جانے
والے حروف نہیں بلکہ سنی جانے والی آواز سچائی کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔

(فروری ۱۹۹۳ء)



خوابوں کی گرہ میں پڑھی لڑکی

اسے خواب پسند تھے۔ مگر وہ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی قطعاً نہیں کہ وہ محض خوابوں کی سلطنت کی شہزادی تھی۔ وہ تکلیف دہ حد تک حقیقت پسند لڑکی تھی بلکہ وہ خوابوں میں بھی حقیقت پسند تھی۔ اور خواب محض ناراضی فرمایا نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل کیلئے نہیں دیکھتی تھی۔ بلکہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن گئے تھے۔ اور کچھ وقت گزرنے کے بعد تو وہ مجھے جوہوں کے بغیر ادھوری ادھوری لگنے لگتی تھی۔

ڈیپارٹمنٹ آنے کا ہمارا وقت کم و بیش ایک ہی تھا۔ اور آتے ہی میں اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ آج اس نے خواب دیکھا یا نہیں اور اگر خواب دیکھا تو وہ کس قسم کا ہو گا۔ ایک عجیب کش آمیز چمک ہوتی تھی اسکی آنکھوں میں۔ سر دیوں میں تو عموماً ہم سیر مٹیاں چڑھ کر اوپر ٹیرس پر چلے جاتے تھے۔ اور گرمیوں میں ہمارا پڑاؤ وسطی صحن کے شمالی کونے میں پڑے ہوئے دو ٹنگوں والے مینچ پر ہوتا۔ کیونکہ دو ٹانگیں اس کی دھچکی تھیں۔ اور ہم نے ہی اپنی ضرورت کیلئے چند انٹیش جوڑ کر اس مینچ کو سارا دسے کر کھڑا رکھا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کو اتنا سمجھنے لگے کہ میں اسے دیکھ کر ہی بتا

سکتا تھا کہ آج اس نے کس قسم کا خواب دیکھا ہوگا۔ جس روز اس نے پاؤں میں پازیب پہنی ہوتی۔ اس روز اس کے خواب میں موجود ہوتا۔ وہ پازیب کو پاؤں کی نہ بانش کے لئے نہیں پہنتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے پاؤں اتنے خوبصورت تھے۔ کہ اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک طرح سے اس کے نزدیک خود کو دوسرے سے منسوب کرنے کے اعتراف کا اظہار تھا۔

جس روز اس نے کانوں میں لہراتے ہوئے جھمکے پہن رکھے ہوتے۔ اس روز وہ بالوں کو ربن سے باندھ کر آتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا کہ آج اس نے بہت مسرت انگیز خواب دیکھا ہے۔ اور سارا دن وہ خوشگوار طرزیں گنگنائی رہے گی۔ اور بالوں کو بھی اسی لیے ربن سے باندھ کر آتی تھی۔ کہ اس روز بالوں کے الجھنے اور بکھرنے کا زیادہ چانس ہوتا تھا۔ تمام دن وہ ہواؤں کے دوش اڑتی رہتی۔ اس روز اسے جو کوس فیو برے لگتے تھے ان کے ساتھ بھی وہ بڑی خوش دلی سے بات کرتی۔

عجیب لڑکی تھی۔ پل میں تولہ پل میں ماش۔ کسی کا ایک جملہ پسند آگیا۔ اپنے دل سے اس کے بارے میں پرانی تلخی بھی نکال پھینکتی۔ کسی نے غیر متوقع طور پر کوئی ناخوشگوار جملہ کہہ دیا پل بہر میں یوں مجلس جاتی جیسے جون کی گرم دوپہر میں دو کوس پیدل چل کر آئی ہو۔

میں نے کہا ناں۔ کہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ میں تو اس کے لباس کا رنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ آج اس نے کس طرح کا خواب دیکھا ہوگا۔ پھر بھی صبح ڈیپارٹمنٹ آنے پر ہمارے پہلی مصروفیت یہی ہوتی۔ کہ میں اس سے خواب کی پوری جزئیات سنتا۔ اور آخر میں وہ بڑا مشکل سوال کرتی۔ کہ میرے خیال میں اس کی تعبیر کیا ہوگی۔ پہلے پہل تو مجھے بڑی مشکل سے گزرنا پڑتا۔ مگر جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ دراصل مجھ سے تعبیر نہیں پوچھ رہی ہوتی بلکہ اپنی تعبیر سنانے کیلئے میدان ہموار کر رہی ہوتی تھی۔

بعض اوقات تو وہ کئی کئی دن تعبیر کی تلاش میں ہٹان ہوتی رہتی۔ اور جب تک کوئی مفروضہ بنا نہ لیتی۔ اس کا خواب مکمل نہ ہوتا تھا۔

میں نے کہا ناں کہ اس کے لباس کا انتخاب اس کے خواب کا عکس میری آنکھوں میں لہرا رہا تھا۔ ایک روز ہم سیرٹھیاں چڑھ رہے تھے۔ کہ میری نظر سامنے صحن میں اُگی ہٹکے جامنی رنگ کی کھیوں پر پڑی۔ جوں جوں زینے اوپر چڑھ رہے تھے۔ کلیاں سامنے آتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس پڑی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ ایک روز میں صبح ہی صبح ڈیپارٹمنٹ آیا تو سیدھا لائبریری گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو سیرٹھیاں اترتے ہوئے میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ اور پھر ہٹکے جامنی رنگ کی پھولدار شلوار اور قمیض۔۔۔۔۔۔ جو زندہ اترتے ہوئے نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ زندہ اتر چکا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دل میں سوچا۔ زندہ چڑھتے ہوئے ان جامنی رنگ کی کھیوں سے جو لطف آتا تھا۔ میں صرف اس سے آشنا تھا۔ آج زندہ اترتے ہوئے ان کو دیکھا ہے۔ تو احساس ہوا ہے۔ کہ اس لذت انگیز مسرت سے تو آج تک میں بیگانہ ہی رہا وہ جھینپ گئی۔ اور دوسری سمت دیکھنے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے سن لیا ہو۔

ایک روز صبح ملی تو کھنے لگی میں نے رات خواب میں صرا دیکھا ہے۔ چند لمے توقف کے بعد بولی "خواب میں صرا دیکھیں تو کیا ہوتا ہے، میں خاموش رہا کچھ نہ بولا، بس اس کی طرف دیکھتا رہا اس نے شاید پڑھ لیا تھا کھنے لگی کیا سفر درپیش ہوتا ہے۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ بس پہنچ کی ٹوٹی ٹانگوں کی طرف دیکھنے لگا جیسے اینٹوں نے سارا دسے رکھا تھا۔ اس نے بتایا آج رات اس نے خواب میں صرا دیکھا تھا۔ پچھتی۔۔۔۔۔۔ پانی کا پتہ بھی دور تک کھیں غلستان نہیں تھا۔ کھنے لگی میں نے کوشش کی کہ کھیں سرب میں ہی پانی کا چشمہ نظر آجائے مگر دور دور تک پانی کا نشان تک نہیں تھا۔

میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس روز نہ تو اس نے پازیب پسی ہوئی تھی اور نہ ہی

اس کے کانوں میں جھمکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں صبرا کی وسعت سمٹ آئی تھی میں بہت دیر تک اور بہت دور تک خود کو ڈھونڈتا رہا مگر اس حقیقت پسند لڑکی کی آنکھوں میں کبھی میرا عکس نہیں تھا۔

عجیب لڑکی تھی۔ خواب سناتے اس کی آنکھیں ڈبڈباتی جیسے حقیقی احوال بیان کر رہی ہو۔ مگر کچھ ہی دیر بعد ایسے ہو جاتی جیسے آنکھوں کے سمندر میں کبھی مدوجزر آیا ہی نہ ہو۔

ایک روز صبح تو اس نے مکمل طور پر سفید لباس پہنا ہوا تھا گرمیوں کی صبح ہم لوگ وسطی صحن کے شمالی کونے میں اسی بیچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھنے لگی 'آج رات میں نے بہت سے کبوتر اڑائے سفید رنگ کے۔ مگر کوئی کبوتر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ میں ہر اگلا کبوتر اس لیے اڑا دیتی شاید یہ پہلے والے کو ساتھ واپس لے آئے۔ مگر صبح ہو گئی اور میں بیدار ہو گئی تم سے بھی تو ملتا تھا۔' اگر تم سے نہ ملتا ہوتا تو اب تک میں کبوتر ہی اڑا رہی ہوتی۔ یہ خواب سنا کر وہ بہت دیر تک زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید پلکوں پر لرزے موتیوں نے انہیں بہت بو جھل کر دیا تھا کہ وہ انہیں اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر اچانک اس نے میری سمت دیکھا اور کھنے لگی پتا ہے اس خواب کی کیا تعبیر ہوگی پھر قدرے توقف کے بعد بولی تمہیں علم ہے کبوتر انتشار کی علامت ہوتا ہے۔ میرے پاس اور بھی کبوتر تھے میں انہیں اڑاتے ہوئے خواب کو مزید جاری رکھ سکتی تھی۔ آخر کب تک؟ تم سے بھی تو ملتا تھا۔ اس لیے میں خود ہی کبوتر بن گئی اور تمہارے کاندھوں پر آئی بیٹھی ہوں۔ اس روز میں بہت چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنا بازو اپنا کندھا ہٹاؤں شاید اسی طرح یہ کبوتر اڑ جائے مگر میں یہ نہ کر سکا۔

ایک صبح ہی صبح مجھے ہی اور میرا ہاتھ پڑ کر سیرٹھیاں چڑھنے لگی۔ بہت جلدی میں تھی۔ اس روز اس نے پازیب بھی پہنی ہوئی تھی اور جھمکے بھی، پازیب کی چھن چھن کے ساتھ جھمکے یوں لہرا رہے تھے جیسے جھوم رہے ہوں۔ دسمبر کی دھند آلود دھوپ

میں ٹیرس پر پہنچتے ہی کہنے لگی۔ آج خواب میں دیکھا میں نے بالکل -غید بے داغ لباس پہنا ہوا ہے۔ اور کہیں سے کپڑوں کا ایک چھینٹا اسے آلودہ کر دیتا ہے۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے دیپ جیسے یکسر بجھ گئے ہوں۔ بہت افسردہ ہو کئی مگر پتہ نہ تھا کیا ہوا۔ کہیں سے دو ہاتھ آئے انہوں نے میری قمیض کے پلو کو دونوں ہاتھوں سے ملا تو وہ بالکل صاف ہو گئی جیسے پہلے تھی۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز کھٹک در ہو گئی اور آنکھیں خوشی سے پھیل کر موٹی ہو گئیں۔ جیسے رات بہت گھری نیند سوئی ہو۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے اور کہنے لگی اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ بہت دیر سوچتی رہی، اور پھر جیسے اسے اس کی تعبیر سمجھ آ گئی ہو۔ اس نے بے خیالی میں پکڑے ہوئے میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور ٹیرس کے دوسرے کونے پر جا کر کچھ ٹپی ہو گئی۔ جہاں دھوپ نہیں تھی۔ دسمبر کی لمبی راتوں میں کورے میں بھیگی ٹھنڈی زمین تھی میرا سایہ میرے قد سے بہت لمبا ہو گیا تھا اور میں ٹیرس پر لیٹے ہوئے اپنے سائے کو پاؤں سے کرید رہا تھا۔ میری پلنگیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ شاید موٹیوں کی جھال نے انہیں بہت بو جھل کر دیا تھا۔

(یکم جنوری ۱۹۹۲ء)



عذاب النار

اب میں سوچتا ہوں کاش میں نے یہ کہانی نہ لکھی ہوتی۔
میرے سامنے ایک خط کھلا پڑا ہے جو مجھے اس رسالے کے مدیر نے ارسال کیا ہے جس
میں میری یہ کہانی شائع ہوئی تھی۔
میرے ایک دوست نے بھی یہ خط پڑھا ہے مگر اس نے اسے دیگر خطوط کی طرح سمجھ کر
کوئی ہمت نہیں دی مگر جو مجھے علم ہے اس سے میرا دوست آگاہ نہیں۔ خط کا مضمون
ایک پینس بن کر میرے دل میں چبھ گیا ہے اور جب دل دھڑکتا ہے تو تکلیف کا
احساس اور بڑھ جاتا ہے۔

کاش اس نے یہ خط نہ لکھا ہوتا یا پھر میں نے یہ کہانی نہ لکھی ہوتی۔ اب تک تو
میں کہانیاں اس لیے لکھتا چلا آیا تھا کہ ان میں میں وہ سچ بول لیتا تھا جو اپنی زبان پر نہیں
لا سکتا تھا مگر اس کہانی کی اشاعت کے بعد مجھے اس سچ کا علم ہوا۔ تو مجھے پتہ چلا کہ میری
کہانیاں کتنا بڑا جھوٹ ہوتی ہیں۔

یونیورسٹی داخلہ کے بعد جس چہرے پر میری نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ وہ چہرہ بہت سادہ
اور عام سا تھا لباس کے معاملے میں بھی کوئی اتنا ادبیت نہیں تھی۔ اور اس عموئیت
نے ہی میرے لیے اسے خاص بنا دیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں پرورش پانے کے باوجود

لباس اور اطوار میں اس قدر سادگی اور معصومیت نے اسے بہت دلکش بنا دیا تھا۔ چونکہ وہ میری ہم جماعت تھی اس لیے اس سے ملنا بات کرنا روزمرہ کا معمول تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ غیر محسوس طریقے سے اس کی ذات کے حصار میں داخل ہو جاؤں اور اس کے لیے میں نے نہایت احتیاط سے کوشش شروع کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ وہ بدک جائے۔

کافی عرصہ تک میرا خیال تھا کہ اسے میری توجہ کا احساس نہیں ہوا۔ اور وہ عام کلاس فیلو کی طرح ہی مجھے سمجھتی ہے مگر کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے کچھ ایسی باتیں ہونے لگیں کہ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ میری خصوصی توجہ کا مفہوم سمجھنے لگی ہے اور اسی وجہ سے مجھ سے گریز کرنے لگی ہے۔ یہ احساس میرے لیے خاصا تکلیف دہ تھا بات یہاں تک ہوتی تو اتنی اہم نہ تھی۔ جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ نثار بیگ کی توجہ کی خواہش مند ہے۔ اور یہ احساس میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ نثار بیگ خود بھی تھا۔ تعلیمی معاملات میں اس کے ساتھ میری حریفانہ کشمکش تو تھی ہی اس کے علاوہ اور کئی باتوں کی وجہ سے ہمارے درمیان شخصیتی اختلافات تھے۔

میرا خیال یہ تھا کہ نثار بیگ اپنی ذات کے حصار میں محسوس وہ شخص ہے جو ذاتی غرض اور مطلب پرستی کو ہر بات پر ترجیح دیتا تھا۔ اگرچہ میں بھی کوئی انسا سوشل نہیں تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں نثار بیگ مجھے پہلے دن سے ہی چھیننے لگا تھا۔ اور اب اس احساس کے بعد تو میرے لیے اس کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

افسانہ نگار ہونے کے حوالے سے کسی کردار کو پرکھنا درجائے کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی اور میں سمجھتا تھا کہ کس طرح دو کرداروں کے درمیان فاصلے بڑھانے جاتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اور اس کے درمیان تعلق کی وہ شکل تو قائم نہ کر سکا تھا جو میری خواہش تھی مگر نثار بیگ اور اس کے درمیان فاصلوں کا میز ضرور ہو سکتا تھا۔

اور یہیں سے میرا مکروہ کردار شروع ہوتا تھا۔

کلاس میں ایک سروے کے سلسلے میں ہم نے مختلف گروپوں میں کام کرنا تھا۔ گروپ رول نمبر کے حوالے سے تشکیل دیے جاتے تھے۔ میرے اور اس کے رول نمبر میں اتنا فاصلہ تھا کہ ہم ایک گروپ میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر اس کا اور نشانہ بیگ کا رول نمبر بالکل ساتھ ساتھ تھا۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک گروپ میں کتنے ارکان ہونگے میں نے حساب لگایا کہ اگر ہر گروپ میں چھ ارکان ہوں تو نشانہ بیگ اور اس کے درمیان حد فاصلہ کھینچی جا سکتی ہے۔ میں کلاس ریپر ریزیشنو تھا۔ اور یہ کام میرے لیے کوئی ایسا مشکل نہ تھا۔ اور اتنی آسانی سے ہو گیا تھا کہ کسی کو شائبہ تک نہ ہوا تھا۔

مگر یہ کافی نہ تھا مجھے دونوں کے درمیان فاصلے بڑھانے کے لیے کچھ اور کرنا تھا۔ اور جو میں نے بتدریج کیا دونوں میں سے بغیر کسی کو اس کا احساس دلانے۔

میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ میں جب نشانہ بیگ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں تو وہ صرف اتنا کہہ دے۔ 'وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گئی تھی کہ کسی اہم معاملے میں مجھ سے بات کرنا ہے۔ لہذا آج شام ضرور گھر فون کر لوں۔'

اس کے ساتھ میری دوستی تو تھی ہی مگر اب میں نے اس کو دوسرے رنگ پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا میں کسی بھی طرح سے نشانہ بیگ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت قریبی ماسم پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اس کے لیے مجھے بعض اوقات جتنے چلکے ڈراسے کرنا پڑتے تھے۔

ہوٹل میں ایک فنکشن تھا جس میں ہماری تمام کہیں نے شرکت کرنا تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرے ایک دوست نشانہ بیگ کو ساتھ لے کر پہلے ہی ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ اور ہاں میں اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ جب وہ اپنی سیڈیوں کے ساتھ آئی تو ہمیں اس جگہ جہاں ان لوگوں نے ہاں میں داخل ہونا تھا۔ میں نے اس کو آواز دے کر روک

لیا۔ اور یونہی ایک آدھ بات کر لی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ لڑکیوں کے ہال میں داخل ہونے اور ہمارے داخل ہونے کے درمیان وقفہ آجائے۔ اور جب میں اس کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ تو نثار بیگ جس کے دل میں پہلے ہی کرہ پڑ چکی تھی۔ اسے یہ فیصلہ کرنے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ ہمارے روابط کس نہج تک آن پہنچے ہیں۔

مجھے پورا یقین تھا۔ کہ نثار بیگ کبھی بھی اس معاملے کی چھان بین نہیں کرے گا۔ اور خود ہی اپنی ذات کے حصار میں بند فیصلہ کر لے گا اور پھر کبھی بھی اس کے قریب نہیں جائے گا۔

وہ پہلے نثار بیگ کے ساتھ وقتاً فوقتاً بات کر لیتی تھی۔ لائبریری میں اس کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔ نثار بیگ کا روزہ بھی خاصاً مثبت تھا۔ مگر اب بتدیج یہ فاصلے بڑھنے لگے تھے۔ اور باہم گفتگو کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تھا۔ اور میرے لیے یہ احساس بست مسور کن تھا۔

اس کے بعد فائنل کے امتحان قریب آ گئے اور ہم اپنے اپنے گھروں میں محدود ہو کر رہ گئے۔ کبھی کبھار بات ہو بھی جاتی تو امتحانات اور نصابی موضوعات سے باہر نہ نکلتی۔

میں آخری دنوں تک اسے اپنی توجہ کا احساس دلاتا رہا۔ اور وہ آخری لمحوں تک مجھ سے گریز کرتی رہی۔ ہاں کبھی کبھار نثار بیگ کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ وہ پتہ نہیں کیوں اسے بیچ میں لے آتی تھی۔ اور یہی بات میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ مگر نثار بیگ اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ اور یہ اطمینان میرے لیے کافی تھا۔

پھر پتہ چڑ کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ گویا اس کے بعد اس کے بارے میں سوچنا میرے لیے بے معنی تھا۔ مگر پھر بھی یوں ہی کبھی کبھار وہ یاد آ ہی جاتی تھی۔ اور پھر میرا کمروہ کردار میرے لیے قابل نفرت ہوتا گیا۔ ٹھیک ہے اگر اس کی دلچسپی مجھ میں نہ تھی۔ مگر میں کون تھا جس نے اس کے اور نثار بیگ کے درمیان فاصلے بودنیے

تھے۔ اور یہ احساس ایک پائس جن کر میرے دل میں چھب گیا تھا۔ میں جب بھی تنہائی میں اپنے ساتھ بیٹھتا تھا تو وہ ادھر ادھر سے نکل آتی۔ مجھے اس کا حساس ہو جانا تھا۔ اور چہ کمپیں سے نثار بیک بھی نکل آتا یہی وہ کہانی تھی جو لکھنے کے بعد مجھے یوں لگا تھا۔ جیسے میرے دل سے پائس نکل گئی ہے جیسے میں نے اپنے مکروہ جرم کا اعتراف کر کے خود کو مسخ کر دیا تھا۔ مگر مجھے کیا علم تھا۔ کہ کہانی چھپ جانے کے بعد ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی۔

نئے دن میں نکلتا تھا۔ شادی کے بعد میں اسی گھر میں آئی تھی جہاں آنے کے بعد سب میری سمجھ میں ہو نیورسٹی سے بہت پہلے رتی بس گئے تھے۔ جو شخص میرا نمبر ایک نہ تھا وہ بہت پہلے میری رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کبھی بعد مجھے آپ کا دھیرن آ جاتا مگر ایسے ہی جیسے آتا تھا پھر چڑ جاتا تھا۔ البتہ اسی قسمی میرے لیے یہ احساس عاسا تکلیف دہ ہو جاتا تھا۔ اور میں خوف سے ڈر جاتی تھی۔ کہ میں سے آپ جیسے شخص سچے اور اچھے انسان کی توجہ کا مثبت جواب نہیں دیا۔ مگر آپ سے قبل میری ایک اور کمٹمنٹ تھی۔ اور اسی کمٹمنٹ نے مجھے ہمیشہ تب سے دور رکھا۔ مگر میں نے خود اپنے آپ کو آپ سے دور رکھا۔ نثار بیک سے مجھے کسی سی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ جب کبھی آپ میری طرف بہت تیزی سے بڑھتے چلے آتے۔ تو مجھے نثار بیک کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ وہ آپ کا تعلیمی میدان میں تربیت تھا۔ اور اسی وجہ سے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ آپ نے اس سچے شخص سے بہت سب نہ علم تھا۔ اور یوں آپ نے مجھے بھی سچ بولنے کا موقع فراہم کر دیا اور ایک مدت سے جو پائس میرے دل میں تھی آج نکل گئی ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ کہانی لکھنے کے بعد آپ کے دل سے وہ پائس نکل گئی تھی۔ آپ بہت اچھے اور سچے انسان ہیں۔ مجھے اب سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی مگر اسے میری خوش قسمتی سمجھ لیجئے کہ میرا چھوٹا دیوانہ اب سے دلچسپی رکھنے کے باعث اکثر و بیشتر ادبی رسائل و کتب گھر لانا

رہتا ہے۔ یہ رسالہ جس میں آپ کا افسانہ چھپا تھا بارے گمہ ایک مدت سے باقاعدہ لگی سے آ رہا ہے۔ ایک روز یونی آپ کے کسی افسانے پر نظر پڑ گئی تھی۔ اور میں نے اسے پڑھ لیا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے گزشتہ سارے شمارے کھینچ ڈالے آپ کی کہانیاں پڑھنے کے لیے۔ اور پھر ہر ماہ آپ کی نئی کہانی کی منتظر رہتی۔ آج یہ کہانی پڑھی تو علم ہوا کہ آپ اپنے بارے میں بھی کتنی سچی اور کھلم کھلا بات لکھ گئے ہیں کہ بے اختیار آپ کی صداقت پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ میری نظر میں آپ کی تکریم پہلے سے بھی دو چند ہو گئی ہے۔ اس رسالے کے مدیر کے توسط سے آپ تک رسائی حاصل کر رہی ہوں امید ہے یہ خط آپ تک پہنچ جائے گا۔

یہ خط پڑھ لینے کے بعد مجھے خوش ہونا چاہیے تھا یا ناخوش اس بات کا فیصلہ تو میں نہ کر سکا۔ البتہ ایک لمحے کے لیے یہ احساس کوند سے کی غرت لپکا اور اس نے مجھے عذابِ انثار میں دھکیل دیا کہ جس شخص نے اپنے بارے میں بھی نامکمل اور ادھورا سچ لکھا ہے۔ وہ جب دوسروں کے بارے میں لکھتا ہوگا، تو وہ تمام کہانیاں کتنی جمعوتی ہوتی ہوں گی۔

(اپریل ۱۹۹۱ء)



ایک جسم اور

شیریں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے فرہاد کو کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور ابھی تک شیریں کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

’آفس سے تو تین بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار لیٹ ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اور آج کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب اس کا فون آیا تھا اور اس نے خالد بی کو بتا دیا تھا کہ وہ آج لیٹ ہو جائے گی۔۔۔۔ کتنی لیٹ؟ یہ خالد بی کا سوال تھا مگر اس کا جواب شیریں کے پاس خود بھی نہیں تھا کیوں کہ یہ تو اس کے پاس پر منحصر تھا۔ پرائیویٹ دفاتر میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس یونہی۔۔۔۔ فارغ بیٹھے بیٹھے جب شیریں بور ہو گئی تو اس نے اس کنسٹرکشن فرم میں ملازمت شروع کر لی تھی۔ محض وقت گزاری کے لئے۔۔۔۔ مگر اب تو جیسے وقت اسے گزار رہا تھا۔۔۔۔

یہ وہ باتیں تھیں جو فرہاد کو لمحہ بہ لمحہ گزرنے والے ساڑھے تین گھنٹوں میں خالد بی سے معلوم ہوئیں۔ اس دوران دو مرتبہ فون کی گھنٹی بجی جسے خالد بی نے اٹھایا۔۔۔۔ گنگو سے یہی قیاس تھا کہ شیریں کی سہیلیوں میں سے تھیں جو شیریں کے گھر پہنچ جانے کے بعد اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں مگر شیریں کی ابھی تک کوئی اطلاع نہ تھی۔ تیسری مرتبہ خالد بی گرم گرم چائے لے کر آئیں۔ تو فہاد نے کوٹ اتار کر

ایک طرف کرسی پر ٹکا دیا اور آئکس دان میں جلنے والی آگ کے شعلوں پر نظریں جما دیں۔ سرخ آگ اپنی دسترس میں پڑی ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ سیاہ کر دیتی ہے مگر جو چیزیں جل کر راکھ نہیں ہوتی وہ سرخ انگارہ ہو جاتی ہیں۔ اس بات کا اسے بارہا تجربہ ہوا تھا۔

جائے کالنگ باتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے خالد بی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر کسی بالواسطہ سوال کے بارے میں سوچا مگر اس اثناء میں وہ ہچکی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھڑکی سے باہر لگی بوگن ویلیا پر ٹکا دیں۔ جس نے برآمدے کے ستون اور دیوار کے کچھ حصے کو اپنے سبزے میں لپیٹ رکھا تھا۔ ڈھلتا ہوا سورج درختوں کے سائے لہے اور ان کے رنگ اور بھی سبز کر دیتا ہے۔

اس کے باپ نے جب اس کا نام فرہاد رکھا تھا۔ تو اس کی ماں نے بہت مخالفت کی تھی۔ بہت نہیں اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات کیسے بیٹھ گئی تھی۔ کہ فرہاد کا کام تو نہر نکالنا ہے کوہ کاٹنا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا تمام عمر تیشہ زنی کی لاد حاصل مشقت سے گزرے۔ اس بات کا ذکر اس نے فرہاد کے باپ سے بھی کیا تھا۔ مگر فرہاد کے بنا۔۔۔۔۔ جو ہمیشہ کے خوش طبع تھے، ہنستے رہتے اور کہتے۔۔۔۔۔ نیکم، سوں میں کیا رکھا ہے۔ اگر اس کے مقدر میں فرہاد کی سی مشقت ہے تو خواہ کوئی بھی نام رکھ لو۔۔۔۔۔ یہ تو اسے ہی کاٹنا ہو گی۔ اور یہ بات تب سے اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ بہت بچپن سے، اور جو باتیں بچپن میں ذہن نشین ہو جائیں تو پھر وہ نہ تو ذہن سے نکلتی ہیں اور نہ ہی ان کے اثرات کی گرفت سے انسان با آسانی نکل سکتا ہے۔

شیریں سے اس کا تعارف جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے بہت پہلے ہوا تھا۔ اور یہ تعلق بہت پرانا تھا۔ شاید اس وقت ان دونوں کو علم بھی نہیں تھا کہ تعلق کی یہ شکل انہیں کس موڑ پر لاکھڑا کرے گی۔

ایف ایس سی میں داخلہ کے وقت اس کے والد نے اسے فیمینئرنگ یونیورسٹی

میں دغدگیلے پڑی انجینئرنگ کے مضامین لے کر دیئے تھے۔ یہاں بھی ماں کی مخالفت شامل تھی۔ ماں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔ مگر والد کو علم تھا کہ ڈاکٹرز کے حالات آج کل بہت خراب ہیں اور خصوصاً جب فہاد ڈاکٹر بن کر نکلے گا تب تک تو ڈاکٹرز کی ملازمتوں میں اور بھی کمی آچکی ہوگی۔ اسے علم تھا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ پانچ سال میڈیکل کالج میں پڑھانے کے بعد فہاد کو وہ کسی اسپیشلائزیشن کے لئے بیرون ملک بھیج سکے گا۔

اب یہ فہاد کی اپنی قسمت تھی۔۔۔ کہ اس میں ایسا ہی لکھا تھا۔۔۔ کہ اس کا داخلہ میرٹ کی بنیاد پر الیکسٹریکل کے بجائے سول انجینئرنگ میں ہو گا۔ اور اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی ایجوکیشن سے چار سالہ انجینئرنگ کا کورس لیٹ سیشن کے ساتھ ساڑھے پانچ سالوں میں مکمل کر لیا تھا۔ نمبروں کے اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ مگر ڈیڑھ سال کی بے روزگاری کے بعد بھی اسے کوئی مناسب ملازمت نہ مل سکی۔ اور وہ محض تجربہ حاصل کرنے کی خاطر پریویسٹ فوٹوں میں ملازمتیں کرتا چلا آ رہا تھا۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ختار میں سعودی عرب کی ملازمت کے لیے چھپنے والے اشتہار کے لیے درخواست بھجوا بیٹھا تھا۔ انٹرویو کال آئی تو وہ چلا گیا۔ اور اس کی سلیکشن بھی ہو گئی۔

یہ اس کی پہلی سلیکشن تھی۔ ڈیڑھ سال کی بیروزگاری کے بعد اس سلیکشن سے اسے نہ تو خوشی ہوئی اور نہ وہ رنجیدہ تھا۔ جانے سے قبل جب وہ آخری بار شیریں سے ملتا تو وہ خوش تھی۔ اس نے بھی تو شیریں کو تسلی دینے کے لیے کہہ دیا تھا کہ سال دو سال کی تو بات ہے بس پھر وہ اپنی شیریں کو ملے جائے گا اور شیریں تو بہت پیٹے سے ہی اپنے آپ کو فہاد کی نانت سمجھتی تھی۔

سعودی عرب کی جس کمپنی میں فہاد کو ملازمت ملی تھی وہ ایک لینڈ ڈویلپمنٹ کی فیم تھی۔ اور ریاض میں ایک ہاؤسنگ سکیم کے لئے زمین کے ترقیاتی کام اس کے

ایک بار شیریں نے اس سے پوچھا تھا کہ آپ کو فی ایجنسرنک کر رہے ہیں۔ تو اس نے بڑی تفصیل سے اسے جواب دیا تھا کہ وہ کاغذوں پر آرکیٹیکٹس کے بنائے ہوئے اور خیالوں میں سوچے ہوئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے ہیں۔ دریاؤں کے دوپاٹوں کو مرنے کے لیے ان پر پل تعمیر کرتے ہیں۔ شہروں میں باغیچے کے لیے سڑکیں بناتے ہیں۔ پرسکون زندگی گزارنے کے لیے عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تو گویا آپ لوگوں کے خوابوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ حقیقت کا رنگ دیتے ہیں کس مختصر انداز میں شیریں نے اس کی ٹیکنیکل گفتگو کو ایک جملے میں سمیٹ دیا تھا۔ فہاد شیریں کی صلاحیتوں کا ہمیشہ سے ہی معترف رہا تھا۔ خصوصاً وہ دب و غیرہ سے دلچسپی کے باعث شیریں کی خوبصورت زبان اور خیالات کی تازہ کاری ہمیشہ اسے معظ کرتی تھی۔

کیا نام بتایا خالد بی آپ نے۔۔۔۔۔ گھنم گھنم کنٹرکشن کمپنی۔۔۔۔۔ گھنم۔۔۔۔۔

گھنم۔۔۔۔۔ شہزادہ گھنم۔۔۔۔۔ ایک بازگشت تھی اس نام کی جس نے فہاد کو بڑے رکھ دیا تھا۔ ایک لمحے میں کتنے ہی خدشات تھے جو آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ اچانک بیٹھے بیٹھے وابھوں کی لپیٹ میں آجانے والوں کے لئے باہر نکلا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

گھنم کون ہے خالد بی۔۔۔۔۔ شیریں تو یہی۔۔۔۔۔ بی بی مالک کا نام ہے۔ بڑی تدبیریں کرتی ہے اس کی۔۔۔۔۔ بہت کم عمر میں اس نے اپنی فوم بنالی ہے اور اب ملکی سطح کے بڑے بڑے تعمیراتی کاموں کے دفتر میں جوتے ہیں۔ کافی بڑی فوم ہے۔ اسی لیے تو اتنی اتنی دیر ہو جاتی ہے بیٹی کو۔۔۔۔۔ میں تو بہت کھپتی ہوں مگر وہ کسی کی سننے تو پہ نہاں۔۔۔۔۔ مگر فہاد بیٹا اب تم آگے ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں شیریں سے کہہ کر اس کے ابا اور امی کو انگلینڈ سے بلواتی ہوں۔۔۔۔۔ تاکہ وہ بھی اپنے فاضل سے سبکدوش ہوں۔۔۔۔۔ بیٹا انہوں نے تو بہت کہا۔۔۔۔۔ مگر شیریں کسی کی سننے تو پہ نہاں! مگر تساری بات نہیں مالتی۔۔۔۔۔

شہزادہ کھٹام۔۔۔۔۔ جوں جوں یہ نام وہ زیر لب دہرا رہا تھا سچے اور سچے۔۔۔۔۔
 کھراتی میں گرتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی سانس بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر
 اپنی آنکھیں کھول دیں اور تیز سانسیں لینے لگا۔ تنفس بحال کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ مگر بعد
 پریشہ۔۔۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے ڈون ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اور جیسے ابھی خون کی گردش رک
 جائے گی۔

شیریں جب واپس لوٹی تو بہت خوش تھی بالکل تازہ دم۔۔۔۔۔ تمام دن دفتر میں
 کام کرنے سے جو اعصابی ٹھنکی ہو جاتی ہے اس کا احساس تک نہیں تھا۔ اور یہ بات
 فہاد کے لئے اور بھی تشویشناک۔۔۔۔۔ شبہات کی کہانی میں تو وہ پیٹے ہی گرچکا تھا۔ اب یہ
 صورت حال دیکھی تو اور بھی لڑکھنیاں کھانے لگا۔

شیریں فہاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر فہاد کو یہ سب مصنوعی لگ رہا تھا۔
 کئی دن گزر گئے۔ کچھ تو شیریں کی مصروفیات تھیں کچھ فہاد ہی کچھ کچھ تھا۔ پہلے بھی
 شیریں نے دو تین مرتبہ اس سے ملاقات کے لئے وقت نکالا مگر اس کے پاس دفتری
 مصروفیات پر بات کرنے کے علاوہ کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں وہ دفتر میں کھٹام
 صاحب کی پرائیویٹ میکر ٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔

اسی میں دو تین مہینے گزر گئے۔ شیریں کے والدین ستمبر میں آرہے تھے اور
 ابھی پانچ چھ مہینے پڑے تھے۔ شیریں کے اصرار پر ہی فہاد نے کھٹام کنسٹرکشن کمپنی
 میں ملازمت کری۔ ابتدا میں تو یہ کنسٹرکشن کمپنی ہی تھی مگر بعد ازاں اسے انجینئرنگ
 کے دیگر پراجیکٹس بھی ملنے لگے۔ مگر نام اس کا یہی پتہ رہا کھٹام صاحب جو اس کے
 پروپر ایٹر تھے بہت چمکے آدمی تھے۔ عمر میں فہاد سے کوئی سال اوپر اس سچے جوں
 لگے۔ مگر چند سالوں میں ہی انہوں نے کاروبار میں اپنے پاؤں جما لیے تھے۔ کھٹام صاحب
 بڑے محنتی اور دہی۔ شب و روز کی تمیز کئے بغیر مصروفیات میں جتے رہتے اور یہی ان
 کی ترقی کا راز تھا۔ ہر وقت خندہ پیشانی سے ملے۔ ورکران کی تعریفیں کرتے نہیں ٹھکتے

تھے۔

پہلے تو فساد مانا مگر شیریں کے اصرار پر اس نے یہ آؤ قبول کر لی۔ ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ایک نہر کی کھدائی کا کام مکھنم کنسٹرکشن کمپنی کو مل گیا۔ کمپنی کی طرف سے جو ساٹھ سو سوے اور مجوزہ پرن پیش کیا گیا تھا وہ بعینہ منظور کر لیا گیا تھا۔ سو سوے کے مطابق نہر کو پہاڑوں میں سے کھود کر لانے سے بہت سارے فوائد مل رہے تھے۔ انسٹلمینٹ نے انجینئرز کی جو ٹیم اس نہر کی کھدائی کے لئے منتخب کی تھی، اس میں فساد کا نام بھی شامل تھا۔ یہ سب محض اتفاق تھا مگر فساد کے ذہن میں بہتہ نہیں کیوں بیٹھ گیا تھا کہ مکھنم صاحب نے اراداً اسے اس پراجیکٹ کے لئے نامزد کیا ہے اور اسے بھیج رہے ہیں۔

وہ جانے سے پہلے شیریں سے بہت الجھتا رہا۔ مگر شیریں کی خواہش تھی کہ فساد یہ نوکری جاری رکھے اور اس کے لئے لازم تھا کہ وہ نہر کی کھدائی والے پراجیکٹ پر چلے جائے۔ شیریں کا ویسے بھی خیال تھا کہ ایک دو مہینوں کے بعد وہ مکھنم صاحب سے کھد کر اسے ہیڈ آفس بدالے کی اور یہ بات پہ فساد کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بس سوئی کہیں الگ لکھی تھی۔

ساتھ پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ یہ اس نے سوچا اس کی ماں اب بھی اسے بچھنے کے لئے تیار نہ تھی مگر باکے یہ وہی الفاظ تھے کہ ناموں سے کیا فرق پر مہا ہے۔ مگر اس نہر کی کھدائی فساد کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے تو یہ اس نے ہی اسے کاٹنا ہے۔ نام خود وہ کوئی بھی رکھ لے۔ ایک وقت حاجب وہ سوچتا تھا کہ شاید شیریں اسے اس لئے مل گئی کیونکہ وہ فساد تھا۔ اور اب سوچتا کہ کاش وہ فساد نہ ہوتا۔

نہر کا پراجیکٹ مکمل تو ہو گیا مگر ٹیم کی آخری ضرب کے ساتھ فساد بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ شیریں نے اپنے خوابوں میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے زیادہ انتظار نہ کیا ابھی فساد کی قبر کی مٹی سوکھی بھی نہ تھی کہ اس نے مکھنم سے شادی کر لی۔ البتہ فساد کی

ماں دن کا بیشتر وقت فہاد کی قبر کے سر ہانے گزرتی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں فہاد کی ماں ہنستے ہنستے رو پڑتی ہے اور روتے روتے ہنس پڑتی ہے۔ اور ایک ہی بات کہے جاتی ہے۔ 'ناموں سے کیا فوق پر مٹا ہے۔۔۔۔ کچھ بھی رکھ لو۔۔۔۔ ہا ہا۔۔۔۔ ہا ہا۔۔۔۔ نام کچھ بھی رکھ لو۔۔۔۔ کیا فوق پر مٹا ہے۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔۔ ہیں ناں فہاد کے ابا کچھ بھی تو نہیں فوق پر مٹا۔۔۔۔'

(فروری ۱۹۹۳ء)



آخری سورج

مکئی کا سوڑا مٹانے کے بعد ٹیلیسی بڑی سرنگ پر آ گئی۔ اس نے حد نگاہ تک دیکھا مگر دور دور تک کہیں کسی سواری کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اور جون کے مہینے میں تو ویسے بھی سورج سوانیزے پر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ مگر آج تو جیسے اس سے بھی نزدیک آ گیا تھا۔ جلا ویسے والی دھوپ میں یورپی آنکھ کھول کر دیکھنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ سرخ بتی پر رکا تو اسے چند قدم دور دو تین بچے نظر آنے لگے۔ کھیلے پھیلے سے لٹھڑے ہوئے کپڑوں میں ان بچوں کو دیکھ کر اس کا دھیان ابھی کی طرف چلا گیا۔ ابھی اس کا اکھوتا بیٹا تھا۔ نام تو اس کا امجد تھا مگر جب اس نے بولنا شروع کیا تو اپنی ماں کو ابھی کہتا تھا۔ تب سے اس کا نام ابھی پڑ گیا تھا۔ ابھی پانچ دن سے بستر پر پڑا تھا۔ اور ان پانچ دنوں میں اس نے اپنی بسات سے بہت بڑھ کر اس کا علاج کروایا تھا۔ مگر بخار تھا کہ ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ٹمپیرچر کی شدت کم ہو جاتی تو ابھی آنکھیں کھول دیتا اور ماں اور باپ دونوں کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آتی۔ پانچ دنوں کے اس بخار نے انہی کو تنگ کی طرح ہلا کر دیا تھا۔ تندرست تو پہلے ہی وہ اتنا نہیں تھا مگر پھر بھی بھاگتا دوڑتا رہتا۔ اور چھوٹی موٹی شرارتوں سے گھر میں رونق لگی رہتی۔ مگر گزشتہ پانچ دنوں سے تو جیسے گھر کو سانپ

سو گئے گئے تھا۔ ایسی خاموشی کہ بس مچی کی سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور کچھ کے در و دیوار سے ایسی وحشت اور خاموشی ٹپک رہی تھی جیسے جنگل کی بیڑوں سے پس آن بھیرا کیا ہو تھوڑا بہت جو پس انداز کیا ہوا تھا ان پانچ دنوں میں ختم ہو گیا تھا۔ اس مسلسل پریشانی و رست دن کی مصروفیت میں وہ ایک بار بھی ٹیسی لے کر نہ رہا۔ ایک دن ٹھہر بھی تو بڑی سرگ پر پہنچنے سے قبل ہی اس کے دل کی دھڑکن میں شدید اضافہ ہو گیا اور وہ چند کڑ بھی آکے نہ چل سکا۔ واپس ٹیسی یا کچھ بھی کر دی۔

اور آٹھ پانچویں روز جب اس کی جیب بالکل خالی ہو گئی۔ ورڈ کٹر کی کچی ہوئی دوالانے کے لیے ایک چوٹی بھی نہ رہی تو اس نے بہت کر کے ٹیسی لائی۔ اس وقت ابھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یا شاید سویا ہو تھا۔ بس ایک اٹھینا تھا کہ سانس چل رہا ہے۔ اس وقت جب کہ پرندے ہی درختوں میں پتوں اور آشیانوں میں دبکے ہوتے ہیں۔ وہ بہت کر کے ٹیسی بڑی سرگ تک لے آیا تھا۔ انجی کی ماں کو تسلی آمیز کلمات کہتے ہوئے اس کی اپنی سمجھیں بھی چمک پرٹی تھیں۔ مگر اس جلتی سہ پہر میں دور دور تک کسی سواری کا امکان تک نہیں تھا۔

اس وقت اسے شہر سے باہر یا کسی دوسرے شہر کی سواری چاہیے تھی۔ تاکہ کچھ روپے تو مل جاتے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ٹیسی کا رخ ایر پورٹ کی طرف موڑ دیا۔ پتہ نہیں اس وقت کوئی فلیٹ آر جی ہو یا نہیں۔ پتہ بھی سے پتہ نہیں کیوں یک امید سی بند رہی تھی۔ انسانی مایوسی کے لمحات میں انسان یہی کچھ تو کرتا ہے خود کو زندہ رکھنے کے لیے اور بدوجہ جاری رکھنے کے لیے خود کو دینے جانے والے اس طرح کے دلاسے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔

شیر پاؤ پل تر گروہ اس وقت کینٹ کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ کہ جب اسے بغلی سرگ میں دور ایک لڑکا نظر آیا۔ ٹیسی کو دیکھ کر اس نے ہاتھ لہر یا پہلے تو اسے شک کڑ مگر ٹیسی روک کر جب اس نے ریورس کی تو ایک تیرہ چودہ سال کا بچہ

جلدی کریں۔ خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ انگل پلیر اور تیز۔۔۔۔۔ در تیز شادمان سے وہ فیروز پور روڈ پر آئے تھک اور پھر کینال روڈ پر مڑ گیا۔

ٹیکسی تو وہ کافی سیڈ سے چڑھا رہا تھا۔ مگر اپنا ٹک بڑھ چہ نے والے ٹیکسے کا احساس لڑکی کی ماں کو نہ ہو سکا۔ بس اس نے ایک مرتبہ کہا جلدی جلدی مجھے ہسپتال پہنچ دو۔ کہیں بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔۔ جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی ماں کا دھیان بیٹی کی اوجھ کھلی آنکھوں کی طرف چڑ گیا۔ اور وہ اس کا نام لے کر چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگی۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔ مگر ان چند لمحوں میں ٹیکسی کینال روڈ پر ہوتی ہوئی یونیورسٹی کیمپس سے آگے نکل گئی تھی۔ وہاں سے وہ وحدت روڈ کی طرف مڑا۔

ٹیکسی جب ایمرجنسی وارڈ کے سامنے رکی۔ تو اس وقت لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اور ٹیکسی ڈرائیور کی نظریں میٹر پر لگی ہوئی تھیں۔ بتیس کلو میٹر۔۔۔۔۔ یعنی ایک سو ساٹھ روپے۔

لڑکی کو ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ اور اس خاتون نے ڈرائیور کو ایڈریس دے کر بیٹے کو ساتھ بٹھا دیا۔ اور کہا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس کے والد کو سفس سے بدلو اور واپسی پہ ساتھ ہی لیتے آنا۔ اور ہاں انہیں کھنا کہ اسے پازہ ٹوبلہ کا بندوبست بھی کرتے آئیں۔ اتنا خون بہہ جانے کے بعد یقیناً خون کی ضرورت پڑے گی۔

لڑکی کے والد کو لانے اور اسے پازہ ٹوبلہ کا بندوبست کرنے میں ٹیکسی نے اتنے کلو میٹر طے کر لیے تھے کہ جب ٹیکسی ایمرجنسی وارڈ کے سامنے آئے کر رکی۔ تو ڈرائیور کے چہرے پر اطمینان تھا۔

رقم لے کر جب اس نے جیب میں ڈالی اور ٹیکسی کو ریورس کرنے کا تو اس کی نظر سامنے پر مچی وہ عورت اپنے خاوند سے لپٹ کر رو رہی تھی جین رہی تھی وہ کسی بھی قسم کا جملہ کانوں میں اندھیلے جانے سے قبل ہسپتال چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ مگر بغیر کوئی آواز

سے بغیر دیکھتے پتہ نہیں اسے کیسے اس بات کا علم ہو گیا۔ کہ ایک زندگی کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ دور کہیں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس دھوئیں میں رستہ دیکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے بیڈ لائش آن کر دیں اور ٹیکسی اپنے گھر کی سمت جانے والی سڑک پر پوری تیزی سے بھاگی۔

راستے میں پتہ نہیں کہاں سے اس نے دوائی خریدی۔ اسے پتہ اس وقت چلا جب اس نے ٹیکسی ماہر برقی سڑک پر ہی کھڑی کر دی۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنے گھر کے قریب ہی فٹ چوڑی کچی میں داخل ہو گیا جس میں نہ رلے بعد اس کے کچر کا دروازہ تھا۔ وہ گھر دوسری کچی سے آیا کرتا تھا۔ اور ٹیکسی عموماً دوسرے راستے سے گھر کے قریب ہی کھڑی کرتا تھا۔ مگر اس طرح اسے بہت پریشانہ منٹ زائد لگ جاتے۔ اور وہ یہ وقت بھی بھانا چاہتا تھا۔ برقی سڑک سے اس تک کچی کا راستہ صرف تین چار منٹ کا تھا۔

اس نے گھر کا دروازہ کھولا۔ تو پورا گھر دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ یہ دھواں پتہ نہیں کہاں سے آ گیا تھا۔ اسی دھوئیں میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ اور پھر اچھی۔۔۔ جو چہرے پر اطمینان اور تسکین سورہا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے بستر پر وہ لڑکی بیٹی ہوئی تھی۔ بستر سرخ لمبو میں بھیجا ہوا تھا۔ اور قطرہ قطرہ خون زمین پر ٹپک رہا تھا۔ دھوئیں کا ایک بادل آیا اور اس نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوائیں ان کے ہاتھ سے نیچے گر گئیں تھیں۔ اور اس کی بیوی اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اندھیرا ہر شے کو گھل رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے سورج پھر نہ نکلنے کی قسم کھ کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہو۔

(اکتوبر ۱۹۹۱ء)



ہابیل

میں نے اسے قتل کرنا تھا۔

شہر کے صدر دروازے تک پہنچنے سے بہت پہلے میں نے اسے قتل کرنا تھا۔
چند روز کے بعد امیر شہر نے مجھے تمذوقار عطا کرنا تھا۔ جس کے بعد میں بھی
باقاعدہ طور پر اس بستی کا مکین ہونے والا تھا۔ میری حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا
سکتے ہیں۔ جو دیارِ غیر میں اجنبی بن کر رہے ہوں۔ تیسرے درجے کا شہری بن کر زندہ
رہنا ایسے ہی ہے جیسے زندگ۔ بارش ہو گئی تو ٹرانا شروع کر دیا۔ بند ہو گئی تو زیر زمین
چلے گئے اور اپنی جلد کی رنگت مٹی جیسی بنا کر اپنے ہونے کو نہ ہونے کے برابر کر دیا۔
ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ امیر شہر مجھے تمذوقار بخشے دے تھے۔ کتنے برس ہو
گئے تھے۔ اس صبر آزا انتظار میں مجھے کیسی کیسی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اب سوچتا ہوں
تو باقاعدہ پسینے میں غمراہ ہونے لگتا ہوں اور اب جبکہ چند روز کے بعد عافیت کی سعید
گمہ می آنے والی تھی۔ اچانک مجھے خبر ملی۔ اس کے ہونے کا اعتبار مل گیا اور یہ بھی بہت
چل گیا۔ کہ اس نے شہر کے صدر دروازے کی سمت سفر شروع کر دیا ہے۔ ایسی
صورتحال سے اگر مجھے کچھ غصہ نہ ہو تو چار ہونا پڑتا۔ تو شاید میری خوشی کی کوئی انتہا نہ
رہتی۔ مگر موجودہ صورتحال میں اس کا صدر دروازے تک پہنچ جانا نہ صرف مجھے آسمانوں

کوئی اجازت نامہ طلب کر سکتا اور پھر وہ جس تیزی سے شہر کی سمت بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ بات میری توجہ میں یسویٰ ہی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی کہ میں کوئی بہتر راستہ سوچ سکتا۔

شہر کے صدر دروازے پہ کھڑے دربانوں سے بات بے سود تھی۔ وہ مان بھی جاتے۔ تو اس شہر میں اس کے خدو خال کی اجنبیت اسے فوراً گرفتار کر دیتی اور پھر ساتھ ہی مین بھی گرفت میں آ جاتا۔

پچھلے کئی دنوں کی شب بیداری اور سوچ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ کہ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے۔ کہ اسے شہر کے صدر دروازے تک پہنچنے سے بہت پہلے قتل کر دیا جائے اور طریقہ کار کچھ ایسا اختیار کیا جائے۔ کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو۔

اس کے ہونے کی اطلاع صرف مجھے تھی۔ بلکہ اپنے سونے کا اسے خود بھی شعور نہیں تھا۔ نہ اسے راستے کی خبر تھی اور نہ منزل کا پتہ تھا اور قبل اس کے کہ اسے اپنے ہونے کا شعور ہو جاتا یا کسی اور تک اس کی خبر پہنچ جاتی مجھے نہایت سرعت اور احتیاط سے اس کا وجود ٹھکانے لگانا تھا۔ مگر کس طریقے سے؟ اس بات کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ جو بات بھی سوچتا۔ اس میں خود ہی خدشے کا کوئی نہ کوئی کیل نکل آتا اور میں اسے مسترد کر دیتا۔

غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ اوائل میں ہی مجھے اس کو ٹھکانے لگانا چاہیے تھا۔ ورنہ اصل اس کے ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت سے ہوئی۔ اس تیزی سے اس کے توانا ہو جانے کے باعث خوف اور دہشت کی کیفیت میرے اعصاب کو شل کر رہی تھی۔ میرے سر میں ایک خاص نوعیت کا درد مستقل رہنے لگا تھا اور اب مسئلہ بقاء کا پیدا ہو گیا تھا اور ظاہر ہے زندہ تو مجھے ہی رہنا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ تو ابھی غور پذیر ہی نہیں ہوا تھا اور مجھے چند روز کے بعد تھوڑے دنوں کا رہنا تھا۔ جس کے بعد مجھے باقاعدہ طور پر اس شہر کا شہری بن جانا تھا اور پھر شہر کے صدر دروازے پر میرا تعارف اور میرا حوالہ

میرے ہر ہنسنے والے کے لیے وجہ امتیاز بن جانا تھا۔

پرائے شہر میں کسی کو راز دار بنا کر اس سے مدد لینا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی۔ کہ میں خود شہر کی حدود سے باہر جاتا اور اسے قتل کر دیتا۔ مگر شاہی مہمان خانے سے اس طرح غائب ہونا بھی مجھے مشکوک کر سکتا تھا۔ اس سارے عمل کے لیے خاصی سوچ سمجھ اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ تمام راستوں اور وقت کی حدود کا تعین کرنا تھا۔ شام غروبِ آفتاب سے لے کر طلوعِ سور سے بہت پہلے مجھے لوٹ آنا تھا۔

میں شہر کی مرکزی لائبریری میں چلا گیا اور وہاں موجود نقشہ جات کی مدد سے شہر کے چاروں اطراف علاقے کا تفصیلی جائزہ لیتے لگا۔

مذہب کی جانب بست بڑا اور گہرا سمندر تھا۔ جو اکثر طغیانیوں کی زد میں رہتا۔ بستی کے تجارتی بحری راستہ کبھی تجارت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مگر اب تو مدت ہو گئی۔ سمندر کی طغیانیوں کے باعث پے در پے کئی جہاز ڈوبے اور یوں تاجروں نے یہ بحری راستہ ترک کر دیا۔

شہر کے شمال کی جانب گھٹنا جنگل تھا۔ کہ اس کی زمین پر کبھی سورج کی آتشیں کرنیں نہیں پہنچی تھیں اور پہلے لکھنے والوں نے لکھا ہے۔ کہ یہاں جیہڑ پھاڑ کرنے والے جنگلی درندوں کی بہتات ہے۔ ویسے بھی جنگل اتنا گھٹنا اور خارزار ہے کہ اس سمت سفر کرنا دشوار ترین ہے۔

جنوب کی سمت شہر کا صدر دروازہ تھا اور ایک بست بڑی شاہراہ کہ جہاں سے قافلے دوسرے شہروں سے آتے جاتے رہتے۔ مسافر سفر کرتے۔ اس بڑی شاہراہ پر سرائیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ ہموار راستہ تھا۔ رات اور دن اونٹوں اور گھوڑوں کی سہولت بھی میسر تھی۔ مگر اس راستے میں کسی کے مل جانے کا اور پہچانے جانے کا پورا پورا خدشہ نہیں بلکہ یقین تھا۔

البتہ شہر کے مشرق کی جانب کچھ دور تک عمر تھا۔ کچھ نشیب و فراز اور اس کے بعد ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان پہاڑوں نے جیسے جبک کر بستی پر سایہ کیا ہوا تھا۔ لکھنے والوں نے لکھا تھا۔ کہ اگر ان پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ جائیں تو طلوع ہونے والا سورج کئی کھنٹے پہلے ہی نظر آ جاتا تھا۔

راستہ دشوار گزار ضرور تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا اور جان جانے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ میری نظر میں اسی راستے پر ٹھہر گئی تھیں۔ اگر ان پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ جاتا تو دوسری سمت اتر سکتا تھا اور بخوبی اس تک پہنچ سکتا تھا۔ بستی سے ایک خاص فاصلے کی حدود سے باہر میں جہاں بھی جوتا اس سے مل سکتا تھا اور پھر میں ہتھالی اس کو قتل کر سکتا تھا۔

تقریباً تمام تفصیلات میں نے لاٹیری میں ہی سٹے کر لی تھیں اور تمام جزئیات کا جائزہ لینے کے بعد میں مہمان خانے میں لوٹ آیا اور شام دھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا پھیلنے ہی میں چھت پر پہنچ گیا۔ شہر کے سارے مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ان چھتوں پر چلتے ہوئے میں شہر کی آخری مشرقی حدود تک پہنچ گیا اور پھر شہر کی فصیل سے دوسری سمت کود گیا۔ راستہ واقعی دشوار گزار تھا اور بستی پر جہاں ہوا پہاڑ جو بظاہر نزدیک نظر آ رہا تھا۔ اتنا نزدیک نہیں تھا۔

صحرا کی مسافت کے بعد اونچا نیچا تھوڑا شروع ہو گیا اور پھر ستاروں کی رہنمائی میں میں پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ دھلو ان راستہ اگرچہ آسان تھا۔ مگر بہت احتیاط طلب۔ کیونکہ دھلو ان ایسی عمودی تھی کہ ذرا سا پاؤں پھسل اور ہزاروں فٹ کی گھرائی منہ کھولے گھر میں تھی۔

جونہی شہر سے باہر فاصلے کی حد ختم ہوئی وہ مجھے بل کیا اور میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اسے قتل کر دیا۔ وہ ابھی اپنے ہونے اور نہ ہونے کی شعور ہی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی مدافعت کے لیے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارے بلکہ چپکے سے

آسانی سے قتل ہو گیا۔ میں نے اس کا ایک ایک عضو علیحدہ کیا اور بکھیر تارہا۔ حتیٰ کہ اس کا سارا تشخص جو کہ بالآخر میری ہی پہچان کا حوالہ بننا تھا۔ بالکل کٹڑے کٹڑے کر دیا اور مکمل اطمینان کر لینے کے بعد میں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔

اگلے روز شہر میں جشن تھا۔ سارا دن بنگامے اور شور شرابے میں گزرا۔ یہ جشن رات گئے تک جاری رہا۔ جس میں مجھے تمغہ و قار بخشا گیا۔ میرے چہرے پر ایک اطمینان اور سکون تھا۔ مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ ڈر نہ تھا۔ تمغہ و قار میرے سینے پر جگمگا رہا تھا اور میں شہر کے معززین میں شامل ہو چکا تھا۔ امیر شہر نے میرے لیے اپنی خاص عنایات کا اعلان کیا تھا۔ لوگ میری توقیر و تعظیم میں جھکے جا رہے تھے۔ اجنبی ہونے کے باوجود میں شہر کی اشرافیہ میں شامل ہو چکا تھا۔ اگرچہ مجھ سے پہلے بھی چند ایک اجنبی لوگوں کو یہ توقیر بخشی گئی تھی۔ مگر پھر بھی ایسے لوگ بہت کم تھے اور میں ان میں سے ایک تھا۔

آج ایک مدت گزر گئی ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے زمانے گزر گئے ہوں۔ میری شخصیت اس شہر کے لوگوں کے لیے عزت و تکریم کی علامت بن چکی ہے۔ میری بڑی شدید خواہش ہے کہ کوئی اس شہر کے صدر دروازے پر آکر میرے حوالے سے اپنا تعارف کروائے اور پھر اپنی عزت و وقار سے میری تعظیم و تکریم کا اندازہ لگائے۔

میں جاہتا ہوں ایسا ہو۔ مگر اب اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہ اسے تو برسوں پہلے میں اپنے ہاتھوں سے قتل کر چکا ہوں۔ زمانے بیت گئے۔ شہر کے صدر دروازے پر کبھی کسی نے آکر میرے نام کے حوالے سے اپنا تعارف نہیں کروایا۔ کبھی دستک نہیں دی۔

ایک خواب کی بشارت

وہ تین تھے۔۔۔ نہیں میرا خیال ہے وہ دو تھے۔۔۔ یا پھر شاید ایک۔
اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل تھا ہاں اتنا ضرور یقین سے کہا جاسکتا
ہے کہ اول اول وہ ایک سے دو اور پھر دو سے تین ہوئے تھے مگر یہ کب کیسے اور کس
طرح ہوا اس کا پتہ نہ تھا۔ جیسے دن رات میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب زندگی سے محروم
جڑوں نے پھوٹ کر اپنا ششخص قائم کرنا شروع کر دیا۔

ہاں آج کی رات یہ بات یقینی تھی کہ وہ تین تھے اور تینوں ایک دوسرے سے
جدا ہونے والے تھے۔ آخری مرتبہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ آخری رات وہ تینوں
اکٹھے گزاریں گے اور صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے جدا ہو جائیں گے۔ اس لیے
ساری رات جاگنا ضروری تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر وہ سو گئے تو پھر شاید طلوع آفتاب کے
بعد ہی ان کی آنکھ کھلے اور پھر تیز روشنی میں ان کی آنکھیں ایک دوسرے کو پہچاننے
سے منکر ہو جائیں اور یہ خوف ان کو ساری رات جگانے رکھنے کے لیے کافی تھا۔

یہ ان تینوں کا مشترکہ فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ دو نے اس کے بارے میں فیصلہ کیا
تھا کہ وہ تینوں رات ایک ساتھ گزاریں گے اور ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ کوئی
بھی فیصلہ ہوتا ان تینوں میں سے کوئی بھی دو اس فیصلے کا اعلان کرتے اور تیسرا خاموشی
سے مان لیتا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

تینوں کی دوستی کی وجوہات تینوں کے نزدیک مختلف تھیں۔ پہلے کا خیال تھا کہ اسے تعلیمی معاملات میں معاونت کے لیے تیسرے کی رفاقت درکار تھی اور دوسرے کے ساتھ اسے لکھنے وقت میں اچھی رفاقت مل جاتی تھی۔ دوسرے کا براہ راست تعلق تو پہلے سے ہی تھا مگر چونکہ پہلے کا تعلق تیسرے سے تھا اس لیے تیسرے کے ساتھ بھی اس کی وابستگی ہوتے ہوتے ہو گئی۔ تیسرے کے مسائل عجیب نوعیت کے تھے۔ وہ جب مصروف ہوتا تو اسے چند لمے نکالنا بھی مشکل ہو جاتا اور اگر کبھی کچھ لمحات نکل آتے تو انہیں گزارنا بہت تکلیف دہ ہوتا تھا اور اسی دوران اسے پہلے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تیسرا جب مصروف ہوتا تو بھی لکھنے بن کا شدید احساس اس کے ساتھ رہتا اور یہیں سے چوتھے کے وجود نے جنم لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود نکلون قائم رہتی کہ ایک وقت میں تین ہی اکٹھے رہ سکتے تھے۔

اب اس کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اس وقت کس کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ وابستگی اتنی قریب تھیں کہ ایک کے ذکر کے ساتھ ہی بت نہ چتا کہ کب ایک سے دوسرے اور تیسرے کا ذکر شروع ہو گیا ہے دوپہر کو پہلا تیسرا اور چوتھا۔ نکلون مکمل تھی یہ تینوں ایک ساتھ وقت گزارنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے مگر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ تیسرے یا چوتھے۔۔۔۔۔ کس کے غلط رویے کی وجہ سے چوتھا خود ہی بساط سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ البتہ پہلا اور تیسرا دونوں ہی رنجیدہ تھے کہ چوتھے کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر دل کے کسی گوشے میں یہ احساس ضرور تھا کہ چوتھے کے اس رد عمل کے پیچھے ضرور پہلے کا یا تیسرے کا ہاتھ تھا۔ بظاہر تو تیسرا ہی ذمہ دار ٹھہرتا تھا۔

بہر حال پہلا اور دوسرا جب دونوں تیسرے کے پاس آئے تو دونوں بے خودی کے عالم میں تھے۔ بے خودی کی یہ شکل پہلے کا ہی مسئلہ تھی چونکہ دوسرا اس سے وابستہ تھا اس لیے وہ بھی اس میں شریک ہو جاتا تھا۔

تینوں اٹھے اور ایک ساتھ باہر نکل گئے اس وقت درمیانی شب تھی۔ جنوری کا دوسرا ہفتہ تھا اور ان دنوں سردی کی تیز لہر نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے پہلے اور دوسرے نے اللہ کے گرد بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ جسے تیسرے نے بخوشی قبول کر لیا اللہ کے گرد بیٹھ کر کہانی کہنے کی روایت تو بہت پرانی ہے مگر پہلے کا خیال تھا کہ اس جلتی ہوئی آگ کے گرد بیٹھ کر اپنے آپ کو دہرتے ہیں اس لیے پہلے نے کہا کہ جس طرح آگ کا جلنا سچ ہے۔ اس طرح ہم بھی آج سچ بولیں گے۔ کم از کم آج کی رات ہم ضرور سچ بولیں گے مگر یہ پہلے کی خواہش تھی۔ دوسرے کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور تیسرا اس سے بچنا چاہتا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر کہاں سے کہانی شروع کریں یا دوست کسی نقطہ آغاز کو تلاش ہی نہیں کر پارہی تھی اور نہ ہی اس حالت بے خودی میں ذہن کسی ایک جگہ پر مرکوز ہو رہا تھا۔

اللہ کے گرد بیٹھنے سے قبل راستے میں وہ ایک جگہ رکے بھی تھے ان کا خیال تھا کہ یہ جگہ بھی بہت اچھی ہے۔ مگر تصویریں دیر کے بعد کسی نہ کسی کے زرنے کی وجہ سے بہت ڈسٹر بنس ہو رہی تھیں۔ اور ان کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا پہلو ٹھا اس نے چادر وہیں رکھ دی اور چند قدم ہٹ کر ازار بند کھول کر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی مگر تیسرے کو اس کی حاجت محسوس نہ ہو رہی تھی کیونکہ ایک تو وہ حالت بے خودی میں نہ تھا اور دوسرا وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو پہلے اور دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا تھا آسمان پر گاد کا تار سے چمک رہے تھے۔

اللہ کے گرد بیٹھے ہوئے تینوں کو کافی دیر ہو گئی تھی چونکہ ارجیکٹار کے وپس آ چکا تھا اس نے رات کی ٹھنڈک کم کرنے کے لیے یہ اللہ روشن کیا تھا اس نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا کہ وہ تینوں ابھی تک بیٹھے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ پہلے نے کہا دیکھو آگ کا جلنا کتنا بڑا سچ ہے۔ دوسرے نے اس کی تائید کی۔ تیسرا بولا مگر یہ سچ ہر

شے کو جلا کر راکھ کر رہا ہے۔ دوسرے نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بس اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو ذرا کھولا اور پھر ایک نظر دیکھ کر ویسے ہی ہو گیا جیسا تھا۔ اس دوران جلتی ہوئی لکڑیوں میں تڑتڑ کی آواز سنائی دی۔ اس پر پہلے نے قہقہہ لگایا بہت طویل قہقہہ تھا۔ اور یہ قہقہہ وہ خاص موقعوں پر ہی لگاتا تھا۔ دوسرے نے آنکھیں کھول دیں تیسرا بھی متوجہ ہوا۔ پہلا بولا 'سب نے جلنا ہے۔ سب کچھ جلنا ہے۔ کچھ چپکے سے جل جاتے ہیں اور کچھ تڑتڑ کر کے جل جاتے ہیں سب جل جاتے ہیں' - چوکیدار نے دو چار اور لکڑیاں اوپر رکھ دیں۔ اور اللہ پھر پہلے کی طرح بہت روشن ہو گیا۔

پہلے نے کہا کچھ سناؤ دوسرے نے بھی تائید کی اب تیسرے کی باری تھی۔ اسے تعمیل کرنا پڑی۔ وہ سناتا رہا، وہ دونوں سنتے رہے۔ اس نے کتنی ہی نظمیں سنا دیں۔ کتنے اشعار سنا دیئے۔ رات بہت ہو چلی تھی۔ چوکیدار ایک طرف دبک کے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے اور دوسرے کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ دوسرے نے کہا لکشی چلتے ہیں پہلا بولا اس ٹھنڈ میں موٹر بائیک پر اتنی دور نہیں جاسکتے۔ پہلا اور دوسرا نئے یا روٹ کھانے کے موڈ میں تھے۔ اور تیسرے کو پورا یقین تھا کہ اس وقت روٹ نہیں ملے گا۔ پہلا بیدل ہی چلنے پر بضد تھا۔ اس کو یقین تھا کہ کو آپ سٹور چوک میں اس وقت تک روٹ والا ضرور ہو گا۔ تینوں چل پڑے رستے میں ڈیپارٹمنٹ آتا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ بند تھا۔ رات کے اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے زینوں پر بیٹھ کر دوسرے نے کہا دیکھو تو لائبریری کیسی لگ رہی ہے۔ پہلے کی اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے تیسرے سے کہا وہ شہزادی والی نظم سناؤ۔ تیسرا ایک مرتبہ پھر نظمیں سنانے لگا۔ نظم ختم ہوئی تو پہلے نے ایک مرتبہ پھر ایک طویل قہقہہ لگایا۔ اور اٹھ کر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ اور بولا میں نے کہا تھا کہ سچ بولو یہ سچ نہیں بول رہا تھا۔ مگر اس نظم میں اس نے اپنے بارے میں سچ بولا ہے۔ ہا۔۔۔ بابا۔ سچ بولا ہے مگر سچ کو بھی جھوٹ بنا کر۔۔۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ غمگین ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ بکٹنے لگا۔ بالکل بچوں کی طرح

سے رونے لگا۔ اور اٹھانک اٹھ کھڑا ہوا "چلتے ہیں" دوسرا اتنی جلدی یہاں سے اٹھ جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر پھر چل پڑا۔

تینوں کو آپ سٹور چوک پہنچے تو سگے اور سیخوں والا بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کا خیال تھا سگے کھائیں گے..... مگر یہاں طے ہوا چکن کڑا ہی ٹھیک رہے گی۔ چکن کڑا ہی بناتے بناتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ پہلے کو جلدی تھی۔ وہ کمرے میں واپس پہنچ کر بے خودی کے تسلسل کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جلدی کی ضد کر رہا تھا۔ دوسرا ابھی تک قائم تھا۔ اور وہ ہاتھ کے اشاروں سے جہاز اڑ رہا تھا۔ بھوک تو پہلے اور دوسرے کو لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ پیٹ بھر کے کھانا نہیں چاہتے تھے۔ البتہ تیسرے نے خوب جی بھر کے کھایا۔ بلکہ جو بیچ گیا وہ سب کچھ کھا لیا۔ اور پھر لاسٹ چلی گئی۔ لوڈ شیدنگ۔۔۔۔۔ مگر کسی نے اس بات کا نوٹس نہ لیا۔ دوکاندار تینوں کے اٹھنے کے انتظار میں تھا۔ لوڈ شیدنگ نے اس کے اس مسئلے کو حل کر دیا۔

تینوں چل پڑے..... واپسی کی مسافت بہت طویل لگ رہی تھی۔ تیسرے نے پہلے کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اتنا چلنے کے باوجود بھی کمرہ نہیں آ رہا تھا۔ یہ پہلے کا خیال تھا..... 'ادھر سے نہیں ادھر سے چلتے ہیں۔' یہ تیسرے کی ضد تھی۔ 'مگر کیوں ادھر سے نزدیک ہے۔' وہ تو ٹھیک ہے مگر بہتری اسی میں ہے ادھر سے اس وقت نہ گزریں۔" تیسرا بولا۔ پہلا بضد تھا۔ نہیں ادھر سے ہی چلیں گے۔" تیسرے نے دوسرے کو سمجھاتے ہوئے کہارات کے اس وقت بیرکوں کے پاس سے گزرنا ٹھیک نہیں۔ "دوسرے کو بات سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے پہلے کو ڈانٹا اور کہا ہاں ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ادھر سے ہی چلتے ہیں..... تصویر میں دور چلے تو دوسرے نے پہلے سے کہا کہ اپنے آپ کو سنبھال کے چلو..... توازن کے ساتھ بس چند گز کے فاصلے ٹیک..... پہلا دونوں ٹانگوں کو اکڑا کر اور بازو پھیل کر پرید کرتے ہوئے چلنے لگا..... فاصلہ طے ہی نہیں ہو رہا تھا۔

کمرے میں بیٹھے تو ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ پہلے اور دوسرے نے اپنے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ تیسرے نے کمبل اٹھایا اور منہ لپیٹ کر سو گیا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا اسے یاد تھا کہ آج کی رات تینوں نے سورج طلوع ہونے تک جاگنا ہے۔ مگر معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پہلے اور دوسرے نے شیشے میں بند کڑواہٹ اپنے اندر اندل لی تھی۔ رات بہت طویل ہو گئی تھی۔

اگلے روز دوپہر بارہ بجے زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز نے تیسرے کو بیدار کیا وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ پہلے نے اسے خدا حافظ کہا دوسرے نے موٹر سائیکل کو لگ ماری اور دونوں رخصت ہو گئے۔ تیسرا ابھی پوری طرح بیدار بھی نہ ہوا تھا۔ گزشتہ گتے گھنٹوں سے وہ جاگنے اور سونے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اس مسلسل بدلتی ہوئی کیفیت سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ساری رات وہ ایک عجیب سا خواب دیکھتا رہا۔ وہ ایک دوکان پر کھڑا ہے اور دوکاندار ایک معصوم سا بچہ ہے۔ وہ اس سے کوئی چیز خریدتا ہے اور پرس کھول کر رقم ادا کرنے لگتا ہے تو اس کی جیب سے جعلی نوٹ نکل آتے ہیں۔ وہ ایک کرکٹا ہوا جعلی نوٹ بچے کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ پہلے تو بچے کو پتہ نہیں چلتا پھر کچھ شک ہوتا ہے۔ مگر اس کے اظہار سے پہلے ہی نوٹ اس کی ہتھیلی سے ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ وہ اس نوٹ کو پکڑنے کے لئے دوڑتا ہے۔ مگر ہوا اس نوٹ کو کبھی ادھر اور کبھی اُدھر اڑائے پھرتی ہے۔ اسی کوشش میں وہ تنک جاتا ہے۔ صبح جب پہلا اور دوسرا اسے خدا حافظ کہنے آتے ہیں تو وہ ابھی تنکن سے چور سو رہا ہوتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب ذرا ہوش بحال ہوتے ہیں تو وہ سوچتا ہے کہ جانا تو صرف پہلے نے تھا..... مگر یہ دوسرا بھی کیوں رخصت ہو گیا۔ مگر دوسرا تو پہلے کی وجہ سے تھا خود ہی جواب دیتا ہے۔ اچھا تو پھر وہ چوتھا؟..... وہ تو کل دوپہر ہی رخصت ہو گیا تھا۔ مگر وہ تو میری وجہ سے تھا اسے تو نہیں جانا چاہیے تھا۔ سوال تو اس نے خود سے کر لیا تھا مگر اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا..... اگر پہلا ہوتا تو شاید وہ اس کا جواب دے سکتا۔



صبحِ کاذب

وہ اُس بستی سے رات کو چھپ کر نکلنے والا پہلا نوجوان تھا۔
 اس بستی کے سرزدہ ماحول اور بزرگوں کی مسلسل نصیحتوں اور حکمِ عدولی کے
 خوف کی وجہ سے بستی کے تمام جوان اعصابی طور پر بست لاغر اور ذہنی طور پر مفلوج ہو
 چکے تھے۔ انہی نوجوانوں کے درمیان اس نے پرورش پائی تھی اور اسی خوف زدہ ماحول
 میں اس کی رگوں میں خون کی گردش نے تیزی سے چلنا سیکھا تھا۔ بڑی حیران کن بات
 تھی۔ وہ مفلوج ہونے سے کیسے بچ گیا تھا۔ مگر اب آکر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اصل
 مسئلہ اس شمع کے جلانے کا تھا جو اس نے اپنے من میں پہلے دن سے ہی جلائی تھی اور پھر
 آج تک اس کی حفاظت کرنا آیا تھا اسے علم نہیں کہ اس کی ہوش سے پہلے اس احساس
 نے جڑ پکڑ لی تھی۔ مگر اب اس کے ہونے کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش
 نہ تھی۔

ہاں البتہ وہ دن اسے اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ بستی سے رات کی
 تاریکی میں نکلا تھا۔ اس رات سارے سفر میں جو اس پر بستی وہ آج بھی تروتازہ ہے۔ جیسے
 آج ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہو۔

بستی سے باہر دور نقطہ آنے والے پہاڑوں میں ایک شمع روشن رہتی تھی۔ سب

جوان جب سن شعور کی بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے تو ان کے بزرگوں نے اس پہاڑ اور اس میں جلنے والی شمع کی تپش کے بارے میں ایک عجیب قسم کا خوف ان کے اعصاب پر مسلط کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ یہ ان کی بستی کی روایت تھی۔ ابتداء میں ہی عمر کے اس حصے میں کچھ اس طرح کی خوف زدہ فضا کا حصار بنا دیا جاتا۔ کہ جب بستی کے نوجوانوں کی رگوں میں گرم لہو ٹاٹھیں مارتا تو اعصابی طور پر کوئی بھی اس شمع تک پہنچنے کے عمل سے گزرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہو پاتا اور یوں عجیب مردنی سی کیفیت میں زندگی کے بقیہ ایام گزار کر ان لوگوں میں شامل ہو جاتا جنہوں نے اسے خوف زدہ کر دینے والے قصے سنائے تھے اور وہ پیچھے آنے والوں کی رگوں میں یہ خوف بھرنے لگتا۔

یہ ان دنوں ہی کی بات ہے۔ جب پہلی مرتبہ ہانک وہ اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تھا اور اس نے اس دور جلتی ہوئی شمع کو دیکھ لیا تھا اور پھر جیسے اسے بہت قریب محسوس کر لیا تھا۔ دراصل اس کے بزرگوں نے در کر دی تھی۔ انہوں نے جب اسے اس جلتی ہوئی شمع کی خواہش سے باز رہنے کی تلقین کرنا شروع کی تھی تو اس وقت تک اس کو قریب سے دیکھنے اور اس کی حدتیں بدن میں بھلینے کی تمنا پوری طرح جڑ پکڑ چکی تھی اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ بستی کے تمام بزرگوں کی تلقین اور نصیحتوں کے باوجود اس کے دل سے اس شمع کو قریب سے دیکھنے اور چھونے کی خواہش مومنہ ہو سکی اور نہ ہی اس کے اعصاب خوف و ہراس کے تسلط میں آکر مفلوج ہوئے اور یوں وہ اس جلتی ہوئی شمع تک پہنچنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی بستی کا رواج تھا شام ہوتے ہی تمام نوجوانوں کو گھروں میں مقید کر دیا جاتا اور پھر صبح پو پھوٹنے کے بعد کمپیں انہیں گھر کی دلیز سے باہر قدم رکھنے کی اجازت ملتی۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ اس بات کا تو علم نہیں ہے البتہ اس سے بہت پہلے سے یونسی ہوتا چلا آ رہا تھا اور سب اسی ارتقاء کی لڑی میں پروئے پہلے جا رہے تھے۔

البتہ جب سے اس نے ایک رات چھت پر چڑھ کر دور پہاڑوں میں جلنے والی اس شمع کو دیکھا تھا۔ کچھ دنوں کے وقفے کے بعد ایک آدھ بار چند لمحوں کے لیے ضرور چھت پر چھری چھپے جا ٹکلتا اور پھر کچھ وقفے کے بعد اپنے کمرے میں آ جاتا۔ پہلے تو یہ وقفے قدرے قلیل رہے پھر ان میں طوالت آنے لگی اور پھر یوں ہوا وہ روزانہ کا عادی ہو گیا۔ گھر میں محلے میں کسی کو اس بات کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ کہ ایک نوجوان اس طرح رات گئے چھت پر جا ٹکلتا ہے اور پھر در تک اس کی نظریں اس شمع کے گرد طواف کرتی رہتی ہیں کہ جس سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لیے بزرگ صدیوں سے چلی آنے والی روایت کو نبھا رہے تھے۔

پھر آخر ایک روز اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ اگرچہ یہ دن کئی ہفتوں کے بعد آیا تھا۔ تاہم کوئی غیر شعوری بات اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی تھی اور آخر اس نے اس تک پہنچنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

یوں تو وہ رات بستی کے تمام لوگوں کے لیے عام راتوں جیسی ہی تھی۔ مگر اس کے لیے اس رات کا تجربہ یکسر مختلف اور ہمیشہ یاد رہ جانے والا تھا۔

رات گئے جب اسے پورا یقین ہو گیا کہ بستی کا ہر باسی اس وقت نیند کی آغوش میں ہو گا تو وہ چپکے سے دبے پاؤں اٹھا۔ اس نے گھر کے بڑے کمرے کے قریب سے گزر کر اطمینان کر لیا۔ کہ تمام لوگ نیند کی حالت میں ہیں اور یوں کدھی کھول کر وہ باہر گلی میں آ گیا۔ گلی اگلے سوڑ تک اسی طرح خاموش اور سناں پر مٹی تھی۔ جیسے یہاں سے کبھی کوئی گزرا ہی نہ ہو۔ گھپ اندھیری رات میں جب کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجائی نہیں دے رہا تھا وہ ایک انداز سے بستی سے باہر اسی سمت کو جا رہا تھا جس طرف دور پہاڑوں کی گود میں وہ شمع روشن تھی۔ ممکن ہے یہ شمع دن کو بھی روشن ہوتی ہو مگر دن کا سورج اس کے وجود پر غالب آ جاتا تھا۔ ہاں البتہ رات کی تاریکی جب ہمارے عالم ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ تو اس شمع کے ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ جس کو قریب سے

دیکھنے اور جس کی تپش کو محسوس کرنے کے لیے آج اس نے بستی کے صدیوں پرانے اصول کو توڑ دیا تھا اور کسی بھی سزا کے خوف کے بغیر اس تک پہنچنے کے لیے ٹکل پڑا تھا۔

بستی سے باہر ٹکل کر جہاں تک وہ مویشی چرانے جاتا تھا۔ وہاں تک کا سفر تو اس نے بغیر کسی خوف کے طے کر لیا تھا مگر اب آگے غیر مانوس راستے پر چلتے ہوئے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ اس نے گرد و پیش کی پرواہ کیے بغیر اپنی آنکھیں اس روشنی کے منبع پر لٹائی ہوئی تھیں جو آہستہ آہستہ روشنی کا گولہ بنتا جا رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک غیر مرمی کشش اس کے قدموں کی رفتار میں اضافہ کر رہی تھی۔ البتہ دل کے کسی گوشے میں دم توڑنا ہوا خوف اس کے قدم جکڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

جنگل شروع ہونے سے پہلے اچانک ایک احساس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑا دی۔ صبح دن کے اجالے سے قبل اسے واپس بستی میں اپنے گھر میں اپنے کمرے کی چار دیواریوں کے اندر پہنچنا ہے۔ کہ سورج طلوع ہونے کے فوراً بعد اسے راز کے افشاء ہونے کا پورا پورا امکان تھا کہ وہ رات بستی سے باہر رہا ہے اور یہ احساس اس کی رفتار میں ایک حیرت انگیز اضافہ کا سبب بنا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے اعصاب میں کھچاؤ بڑھنے لگا تھا اور پھر اسے گردن کے پٹھے اکڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ درد کی ایک لہر اٹھتی تھی اور پھر آپ ہی آپ دم توڑ جاتی تھی۔ اسے شمع تک پہنچنا تھا۔ اس روشنی تک پہنچنا تھا اور پھر دن کے اجالے سے بہت پہلے واپس بستی بھی پہنچنا تھا۔ وہ جب نکلا تھا تو اسے اندازہ نہیں تھا۔ کہ سفر اتنا لمبا ہو جائے گا۔ گھر کی چھت پر سے تو شمع بالکل چند کوس کے فاصلے پر نظر آتی تھی۔ مگر اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی ابھی فاصلہ تھا کہ کٹھن کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

خارزار جنگلی راستے سے گزرنے کے بعد آگے ریت کا دور تک پھیل ہوا نرم میدان تھا۔ جہاں پاؤں رکھتا اندر ہی دھنستا چلا جاتا۔ سانس تو اس کی پھول رہی تھی مگر صحرا کی ریت کی ٹھنڈک نے اس کے پیروں کو ایک عجیب ٹھنڈک سے آشنا کیا تھا۔ کہ طویل خارزار راستے کی ٹھکن بھی کم ہونے لگی تھی۔ صحرا کی طویل مسافت کے بعد اب ونچا نیچا محاذ شروع ہو گیا تھا۔ کبھی تو اس کا پاؤں کہیں کھد میں جا پڑتا اور کبھی کسی پتھر یا اونچی جگہ پر اس نے کافی کوشش کی راستے کی اونچی نیچے کا اندازہ لگانے کی۔ مگر ہر مرتبہ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا تھا۔ البتہ اب اس روشنی کے قریب ہونے کا احساس ہونے لگا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا سفر رانگاں نہیں گیا تھا اور یہی وہ احساس تھا جس نے اس کی تمام ٹھکن ختم کر دی تھی۔

اس نے راستے کی ان تمام مشکلات کو طے کر لیا تھا۔ جس کا ذکر اس کے بزرگوں نے اس سے اور بستی کے فوجوانوں سے اس انداز سے کیا تھا۔ کہ کسی میں حوصلہ ہی نہ چھوڑا تھا۔ کہ اس مسافت پر نکلتا اور وہ تمام فوجوان اپنے مفلوج ذہنوں اور تھکے اعصاب کے ساتھ کھروں میں بند پڑے تھے۔

اور پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے یک دم بہت سی روشنی کی بارش ہو گئی ہو اس کا سارا وجود اس روشنی میں بھیک گیا۔ اتنی تیز روشنی میں بھی وہ آنکھیں کھول کر سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ روشنی کے اس سیلاب میں کہیں کہیں ہلکے نیلے رنگ کی لہر تیر جاتی تو اس کا جسم ایک عجیب قسم کی لذت سے سرشار ہو جاتا۔ وہ گھٹنے ٹیک کر دوڑا نو بیٹھ گیا۔ اس کا سر احترام کے جذبے سے جبک گیا تھا۔ لذت و سرشاری کی اس کیفیت نے اس کے اعصاب سے ٹھکن اور زخم ایسے کھینچ لیے تھے جیسے بے دھبائی میں چھو جانے والا کاٹا کھینچ لیا جاتا ہے۔

روشنی کے سامنے یہ چند لمے کی کیفیت تھی۔ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک خدشہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ کہیں روشنی اس کے پاؤں نہ پکڑ لے۔ کہیں وہ صبح کے اجالے

سے قبل بستی پہنچنے میں ناکام نہ ہو جائے۔ مگر اس لمحے اسے یوں لگا۔ جیسے روشنی کے احساس نے ہی اس کے اندر اس فیصلے کی قوت پیدا کی ہے۔

وہ اٹھے پاؤں چلتا ہوا واپسی کی مسافت طے کرنے لگا۔ روشنی اس سے دور ہونے لگی۔ مگر ایک عجیب طرح کی لذت نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور لمحہ بہ لمحہ دور ہونے کے باوجود بھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اب بھی وہ روشنی کے سامنے دوڑا نو بیٹھا ہے یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ان لذتوں کے لطف کو پوری طرح سے اپنے احساسات میں زندہ نہیں رکھ سکا اور یہی وہ احساس تھا۔ جو اسے دوبارہ یہاں آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ دوبارہ آنے کی خواہش وہاں سے لوٹنے سے قبل ہی جڑ پکڑ چکی تھی۔

اپنی بستی میں واپس پہنچنے کو تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے قبل ہی پہنچ گیا تھا۔ البتہ واپسی کے سفر میں قدرے مختلف تجربہ ہوا تھا۔ اب کے نہ تو پہاڑ ہی راہ میں آنے نہ صحرا تھا اور نہ جنگل بلکہ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے بستی کو جانے والا ایک ڈھلوان راستہ ہے اور وہ مسلسل نیچے تھوں میں اترتا جا رہا ہے واپسی پہ اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے کتنا بندی کا سفر طے کر لیا تھا۔

مسلسل گھرائی میں اترنے کا یہ تجربہ بھی بہت لذت انگیز تھا۔

صبح بیدار ہوا تو رات کی یہ تمام مسافت اسے خواب کی سی کیفیت لگی۔ مگر جوں جوں اسے تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس سارے عمل کے حقیقی ہونے کا گمان ہوتا جا رہا تھا۔ اگلے روز سارا دن معمول کے مطابق ہی تھا۔ کوئی بات کوئی لمحہ گزرنے والی کل سے مختلف نہ تھا۔ البتہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی رات کا انتظار کرنے لگا تھا اس عمل کو برسوں گزر گئے۔ اس نے اپنی ان راتوں کو دل میں رز کی طرح دفن کر دیا تھا اور کبھی کسی کو شائبہ تک نہ ہونے دیا۔ ہاں البتہ کبھی کبھی اسے یہ احساس ضرور ستانے لگتا۔ کہ اس کی بستی کے تمام نوجوان ذہنی اور اعصابی طور پر مفلوج تھے اور ان میں کوئی بھی ایسا

نہیں تھا۔ جو روشنی کے اس مینار تک سفر کر سکتا۔ یوں اب بھی تو وہ اس مسافت میں تنہائی کا عادی ہو چکا تھا۔ ہاں البتہ اس میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی۔ کہ جب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچا کہ جب اس کی بستی کے بزرگ نوجوانوں کو اس روشنی کے مینار کی خواہش سے خوف زدہ کرتے تھے اور شام ہی شام گھروں میں مقید کر دیتے تھے اور پھر صبح کے اجالے سے قبل گھروں سے باہر نکلنے پر پابندی ہوتی تھی۔ وہ اپنی بستی کے نوجوانوں کو اس طرح کی کوئی بات نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ روشنی کی سمت مسافت کا راز اب بھی اس کے سینے میں دفن تھا اور اس نے کسی کو بھی ایک انجانے خوف کے باعث اپنا ہم راز نہ بنایا تھا اور پھر ایک روز اچانک اسے احساس ہوا۔ کہ بستی میں اس کی عمر کے جتنے بھی بزرگ تھے ان میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے آنے والے نوجوانوں کو شام ہی شام اپنے گھروں میں مقید ہو جانے کی تلقین نہیں کرتا اور نہ ہی صبح اجالوں کے طلوع ہونے سے قبل گھروں سے نکلنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔

(مارچ ۱۹۹۳ء)



سنہری حروف

میں اس وقت جیسرنگ کر اس میں شاہراہ قائد اعظم کے اس مقام پر کھڑا ہوں کہ میرے سامنے اسمبلی ہال کی دو منزلہ عمارت اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے موٹے دو منزلہ ستونوں سے استقامت جھلک رہی ہے اس کی جزوی ڈھلوان چھت سے گھرے تحفظ کا احساس ہوتا ہے مگر اس پر نظر پہنچنے سے قبل درمیان میں سمٹ مینار آ جاتا ہے جس کے چاروں طرف سرخ پتھر کے ڈھلوان بلاک اس طرح ایستادہ ہیں کہ ان کی ڈھلوانوں کا رخ سمٹ مینار کی اس جانب ہے جہاں وہ زمین سے اگا ہوا ہے۔ سمٹ مینار جہاں یکتائی و وحدانیت کے تاثر میں پٹا ہوا ہے وہاں اس کے راتوں رات آگ آنے کا احساس بھی ہوتا ہے حالانکہ اتحاد و یکتا ہونے کا جو درس سمٹ مینار سے ملتا ہے اس کے حصول کے لیے قوسدییوں کی جدوجہد بھی ناکافی ہوتی ہے۔ یہ فنِ تعمیر کا کمال ہے یا یہاں کی پُراسرار فضا کی مضبوط گرفت کہ عین اسمبلی ہال کے سامنے اتنا اونچا مینار دیکھ کر دونوں عمارتوں کے درمیان ایک غیر مرئی ماس تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

اچانک میرا دھیان اس چھت کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو سمٹ مینار کے قریب بائیں جانب ایستادہ ہے اور جسے چاروں کونوں سے چار ہاتھوں کی تین تین انگلیوں نے

سہارا دے رکھا ہے اور جو اسی سرسبز و شاداب فضا کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گئی ہے اور جس کے نیچے سنہری حروف میں لکھا ہوا قرآن محفوظ کر دیا گیا ہے۔

میں کئی کئی گھنٹے اس فضا کے سر میں گرفتار رہا ہوں۔ شاہراہ قائد اعظم سے گزرتی بے شمار گاڑیوں کے دھوئیں اور بارن کی آوازوں نے کبھی میری یکسوئی کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ بسا اوقات تو ان کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

شاہراہِ فاطمہ جنتان سے آتے ہوئے اچانک ہی میں اس پراسرار فضا کے سر میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر گویا میرا معمول بن گیا۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا چند لمحے رک کر ضرور ان عمارتوں کی زبان سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ جو خاموش چپ چاپ کھڑی ضرور کچھ نہ کچھ اپنی زبان میں کہہ رہی ہوتیں۔

کبھی تو عمارتیں انسانی مغموم اور اداس نظر آتیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک آنے والے آنسوؤں کی نمی میں اپنے رخساروں پر محسوس کرتا۔ کبھی مجھے ان کے قہقہے سنائی دیتے۔ ہوا کے تیز جھونکے ان کی کھٹک مجھ تک لے آتے اور کبھی یوں لگتا جیسے یہ عمارتیں کسی گھمری سوچ میں گھم رہی ہوں توں سے اس انتظار میں ہیں کہ شاید کوئی دنا ویدنا آئے۔ جو ان کی زبان سمجھے اور ان کے محسوسات کو کوئی شکل دے سکے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرا مجھے کسی نہ کسی پیغام کی سرگوشیاں ضرور سنائی دیں۔ مگر میں اپنی مصروفیات کے سبب کچھ زیادہ وقت ان کے درمیان نہ گزار سکا۔ ہاں البتہ میرے اور ان کے درمیان ایک رشتہ ضرور استوار ہو گیا ہے۔ دن میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی بہانے میں ضرور ان کے درمیان سے گزرتا ہوں۔ سب عمارتیں اپنی اپنی زبان میں میرے ساتھ گفتگو کرتی ہیں۔

مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں میں کب پہلی مرتبہ چند لمحوں کے لیے رکا تھا اور پھر یہ لمحے پھیل کر گھنٹوں پر محیط ہو گئے تھے۔ البتہ ان تمام چیزوں کے ساتھ میری خاصی انسیت ہو گئی تھی اور مجھے اپنا وجود بھی اسی فضا کا حصہ لگنے لگا تھا۔

ہاں تو میں شاہراہ قائد اعظم کے اس مقام پر کچھ اہوں جہاں میرے سامنے اسمبلی ہاں کی دوسرے عمارت ہے۔ جس کے سامنے سٹینڈر اتحاد و یگانگت کی علامت کے طور پر اُبھرتا ہے۔ اور اس طرح استاد ہے جیسے یہ بھی اسمبلی ہاں کا ہی حصہ ہے۔ سٹینڈر کے گرد ڈھلوان بڑکوں نے اپنے وجود نصیب سے زائد زمین میں اتارے ہوئے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کو ان کے پیچھے اسمبلی ہاں کی عمارت اپنے تمام تر جہاں و جہاں کے ساتھ نظر آسکے۔

میرے دائیں طرف واپڈا ہاؤس کی ایک جدید طرز کی عمارت ہے۔ جس کی تعمیر کا زمانہ یقینی طور پر الفلن سے بعد کا ہے۔ اسی وجہ سے یہ نسبتاً جوان اور اجلی نظر آتی ہے۔ سفید سیمنٹ میں پلستر کی ہوئی عمارت اگرچہ اپنا انداز شخص رکھتی ہے۔ پھر بھی ارد گرد کی عمارتوں کے ساتھ اس کا تعلق محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ بھی باقی عمارتوں کے ساتھ اس فضا کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دوسرے اوپے ستون اس کو اسمبلی ہاں کے ساتھ ملائے ہیں۔ اور ان ستونوں پر کھدی ہوئی لکیریں اور سفید رنگت اس کا سٹینڈر کے ساتھ تعلق جوڑتی ہے۔ واپڈا ہاؤس کے اوپر گنبد نما حصہ جس کی کچھ کیوں سے روشنی چھن چھن کر عمارت کے اندرونی وسطی حصے پر پڑتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے عمارت کو توقیر بخشنے کے لیے اس کے سر پر ٹوپی رکھ دی ہو۔

میرے بائیں ہاتھ پر الفلن کی چھ دوسری عمارت ہے۔ جس کو موسموں سے تحفظ دینے کے لیے فقی اور محمودی شید بنائے گئے ہیں۔

واپڈا ہاؤس اور الفلن بلڈنگ دونوں اسمبلی ہاں کے ساتھ یکساں زاویہ بناتی ہیں۔ ان کے ٹائڈ سے دونوں میں فرق ہے۔ الفلن ذرا اوچیر طرہ ہے۔ یوں بھی اس میں مختلف انواع کی سرگرمیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ واپڈا ہاؤس نسبتاً جوان ہے۔ دونوں عمارتوں کے سامنے ٹھوٹی لن ہیں جہاں سبز کھاس بھی ہے اور اونچے اونچے درخت

بھی۔ دونوں عمارتیں زمانہ اور فن تعمیر ہر دو حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر پچھلے بھی مجموعی طور پر اس فضا کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔

میری پشت پر شمس و فیض جنت ہے۔ جس کے ایک طرف بہار آرتے کا نسل کی عمارت ہے اور دوسری طرف شاہدین بلڈنگ ہے۔ غم میں یہ سب سے زخمی ہیں۔ دونوں کا ریت ایک وقت میں ایک دوسرے کی جانب مچی ہے اور گزری تیرہ یعنی سمٹ بیٹار کی طرف بھی ہے۔ دونوں کے عمارتی انداز بھی ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ تمام عمارتیں مل کر جیسے رنگ کر س کی مجموعی عمارتی فضا کو زیب دیتی ہیں جس کے سر میں میں پچھلے کسی مہینوں سے گرفتار ہوں۔ وہیں کا کچھ حصہ دور کے درمیان گزارتا ہوں۔

اب تو میں ان کی زبان سے بھی خاصا مانوس ہو گیا ہوں۔

آج اس وقت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ میں شمس و فیض جنت کے منظر پر کھڑا ہوں۔ جہاں میرے سامنے سمیٹی ہوئی ہے میری دہلیز میں جانب واپار دوسرے سے اور بائیں جانب لکڑی کی عمارت استاد سے میں اپنی اس حسرتی فضا میں شاید کبھی بھی کسی کو شامل نہ کرتا۔ مگر آج میرے لیے ایک مسئلہ پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرنے سے میں قطعی طور پر قاصر ہوں۔ کتنی ہی دور ہو گئی ہے مجھے یہاں کھڑے ہوئے۔۔۔ میرے آگے پیچھے دائیں بائیں تمام تر میں ویران ہیں۔ دور دور تک کسی قسم کی کوئی کاروباری نہیں ہے۔ انکا دکا کوئی کمزور ہے تو میں ان کے پیروں کی چاپ سن کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ میرے پردہ سعادت پر فوجی بوٹوں کی سوز خراشیں دس رہی ہے اور یہ خراشیں تکلیف دہ مد تک ہل رہی ہیں۔ میرے لیے پریشانی کا باعث دراصل وہ فکر مندی اور اندیشے ہیں جو ان عمارتوں کے چہروں پر رنگ رہے ہیں۔

جدھر بھی گاہ ٹھٹھاتا ہوں ایک ہی سوال لٹکا ہوا ہے۔۔۔۔۔ کچھ ہونے والا ہے۔ آج کچھ خوف معمول ہونے والا ہے۔ فوجی بوٹوں کی آواز اس خدشے کو اور بھی تقویت دے رہی ہے۔ شہر کی سڑکوں پر پیدا ہونے والی آواز کی بازگشت دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا کچھ سچائی نہیں دے رہا۔

”میرے ضد کیا معاملہ ہے اسی سوچ و پریشانی کے عالم میں میں اپنی باتیں جانب شاہرہ قائد اعظم پر دیکھتا ہوں۔ دور کہیں رنگ برنگے جھنڈے اور کپڑے کے سینر نظر آتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا۔۔۔ آگے بڑھتا ہوا لوگوں کا ہجوم۔۔۔ جو ماتہ دینے اونچے کر کے اپنی ترم تر توانائیاں صرف کر کے، چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے ہیں۔

بست سی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں اپنی دائیں جانب دیکھتا ہوں۔ تو دور مجھے ویسا ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ بڑھتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ آگے۔۔۔ اور آگے۔ آخر ان لوگوں کے مسائل کیا ہیں نہ سے کیا ہیں۔۔۔۔۔ سینروں پہ کیا لکھا ہوا ہے۔ مگر فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ مجھے پتا نہیں چل رہا۔

میرے سامنے کھڑی عمارتیں بھی کچھ نہ کچھ جانتے کے لیے حسب استطاعت اپنی گردن آگے بڑھا رہی ہیں مگر بے جان عمارتیں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتیں۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کے بے جان ہونے کا احساس ہوا ہے۔ مگر اس سے قبل تو یہ عمارتیں ہمیشہ مجھے متحرک باتیں کرتی، منستی روتی اور کاتی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر آج مجھے احساس ہوا کہ یہ عمارتیں تو اپنی جگہ سے یک انچ بھی نہیں بل سکتیں۔ کیوں کہ ان کی ذرا سی حرکت ان کو اپنے ہی قدموں پر کرا سکتی ہے۔ اور اسی خوف نے ان سے حرکت کی قوت سلب کر لی تھی۔

میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ تو شاہرہ ایفانہ جنن پر بھی ایسی منظر تھا۔ سامنے نظر پڑی تو اسمبلی ہال کی دونوں بغلوں سے چپختے ہوئے نہ سے اور جھنڈے نظر آنے

لگے۔ چاروں طرف لوگ ہی لوگ تھے اور فلک شگاف نور سے ہی نور سے سنائی دے رہے تھے۔

جوں جوں جلوس قریب آتے گئے۔ چیزیں واضح ہوتی گئیں اور نور سے سمجھ میں آنے لگے کہ اس سارے عمل اور رد عمل کے اصل محرکات کیا ہیں۔

ایک طرف سے کان میں آواز پر مبنی "ہم سندھی ہیں" تو دوسری طرف "ہم پنجابی ہیں" میرے آگے بلوچی اور چچھے پٹانوں کا جھوم چلا آ رہا تھا۔ . . . سب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ . . . ہماری زبانیں مختلف ہیں۔ . . . ہماری نسلیں مختلف ہیں۔ . . . ہمارے لباس مختلف ہیں۔ . . . رہن سہن کے امور مختلف ہیں۔ . . . لباس کے رنگ مختلف ہیں۔ . . . ہمیں اپنے مفادات کا تحفظ دو۔ . . ہمارا مقدر محض جدائی ہوئی دھوپ نہیں۔ . . . ہمارے حصے کی بارش دوسروں کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ . . . ہمارے حصے کی چھوٹی ہمارے لیے ناکافی ہے۔ . . . ہمیشہ ہم سے ہمارے حقوق چھینے کئے ہیں۔ . . . ہم سب ہیں۔ . . . ہمارا اپنا شخص ہے۔ . . . ہماری اپنی تہذیب و ثقافت ہے۔ . . . ہمارے درمیان صرف اختلافات ہیں۔ . . . پھر ہم کیسے اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ . . . ہمارے خون کی رنگت کا ایک ہونا۔ . . . ہمارے مذہب کا ایک ہونا۔ . . . زندگی کے نسب العین کا ایک ہونا۔ . . . ہمیں یکتا و اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ یہ محض قریب ہیں۔ جو ہمارے حقوق پر غاصبانہ قبضے کے لیے ہمیں دیے گئے ہیں۔ اب اور دھوکہ ناقابل برداشت ہے آوازیں لمحہ بہ لمحہ آ رہی تھیں اور یہ آوازیں اتنی قریب اور اتنی اونچی ہو گئیں کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ جھوم چوک میں آ کر ٹھہر گیا تھا مگر آوازوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عجیب سا خوف میرے اوپر مسلط ہو گیا۔ اور میں سہم گیا۔ اب میری آنکھوں کے سامنے یہی عمارتیں تھیں اور

کمانوں میں ان کی سرگوشیاں۔

سب سے پہلے لٹریچر کا سبب ہوئی۔ میں رقبے میں تمام عمارتوں سے بڑی ہوں۔ میرے اندر ہر طرح کی سولتوں کی فروانی ہے۔ میں کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں میرے جنوب اور مغرب کے رخ جلتے رہتے ہیں مگر ان معمولی مسائل کے باعث میں نے کبھی علیحدگی کا تصور نہیں کیا۔

شاہدین اور لاہور آرٹ کونسل کی عمارات گویا ہونیں۔ عمر کے اس حصے میں ہمیں سارے کی زیادہ ضرورت ہے۔ استقامت کے لیے زیادہ توانائی چاہیے۔ اور یوں بھی ہم مرکزی سرسبز و شاداب حصے سے دور سارا دن دھوپ میں جلتی رہتی ہیں۔ مگر ہماری بناء اور عظمت اسی میں ہے کہ ہم یہیں کھر مٹی اپنا شخص برقرار رکھتے ہوئے اس مجموعی فضا کا حصہ بنی رہیں۔

واپڈ باؤس جو نسبتاً کم عمر اور کم تجربہ کار تھی جیسے لمبے میں بولی میں سب سے زیادہ جوان اور زور آور ہوں۔ میری شکل و شبہیت بھی نمایاں اور ٹانگوں میں بھی بے شمار توانائی ہے مگر میں نے کبھی بھی علیحدگی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

اسمبلی ہاں کی عمارت کے جاہ و جلال میں اچانک دھیر ساری شفقت اور محبت نمود آئی۔ اس نے تمام عمارتوں کو آقرین کہا اور نہایت تحمل سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”تم سب میں اختلافات اپنی جگہ موجود ہیں۔ تمہارے ظاہری رنگوں میں اختلافات ہیں۔ بنیادی عمارتی ساز و سامان میں اختلافات ہیں تمہارے درمیان عمروں کا تفاوت موجود ہے۔ کچھ عمارتوں کو دن کے مختلف اوقات میں شدید موسمی اثرات کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حجم کے لحاظ سے قد کے لحاظ سے بھی تفریق موجود ہے مگر ان سارے تفرقات کے باوجود تم سب کے اندر انفرادی شخص کے بجائے اجتماعی شخص کو بحال و قائم رکھنے کا جذبہ موجود ہے۔ اور یہی وہ احساساتی سرمایہ ہے۔ جس نے تم سب کو اکٹھا رکھا ہوا ہے۔ اور تمہارے اس اجتماع نے ہی تمہیں انسانوں کی اس بستی میں ایک نمایاں

مقام دے رکھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں زبان عطا کرنے کی بجائے اجتماعی شعور سے نوازا ہے۔ جس کی روشنی میں ہم نے سنا بہت حیات کے زیریں اصولوں کا تعین کیا ہے۔ اور یہی ہمارے شخص اور زندہ ہونے کی علامت و ضمانت ہے۔

اسمبلی ہاں کا آخری جملہ سن کر میرا دھیان ان سنہری حروف کی طرف پڑ گیا جو اس چمت کے نیچے پڑے تھے جس کے چاروں کونوں کو چار ہاتھوں کی تین تین انگلیوں نے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور اس چمت کی جانب دیکھا۔ جس کے نیچے سنہری حروف پڑے تھے۔ مگر اونچے اونچے بانسوں اور ان میں ٹٹے ہوئے بیسروں نے ان کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ اور میرے بازو نہ تو اتنے لمبے تھے ورنہ ہی اتنی توانائی کے حامل۔ کہ میں ان بیسروں کو پر سے ہٹا کر نوگوں کو ان سنہری حروف کی طرف متوجہ کر سکتا۔

(اگست ۱۹۹۰ء)



میں جی گئی ہے اور اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ شام بھی جب وہ کھیتوں سے لوٹا تھا تو ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی خوشوں بھری فصلیں اسے بہت معصوم لگیں۔ وہ بھی اسی معصومیت سے ہنس پڑا تھا، ان لہراتی فصلوں کی بے خبری پر کہ جنہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ان کو کاشت کرنے والے توانا ہاتھ ان کو کاٹ نہیں سکیں گے۔

شام ہو رہی تھی۔ اور علی ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ علی کی ماں اب تو دروازے سے ہی لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کتنی دفعہ دروازے تک جا کر لوٹی تھی۔ مگر لمحہ بہ لمحہ چلتے ہوئے دن نے اس کی آنکھوں کو عجیب قسم کے واہموں اور شکوک و شبہات کی گرفت میں لے لیا تھا۔

پچھلے تین دنوں سے علی ذہنی طور پر فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بھی جنگی جہاز فضا کو چیرتے ہوئے گزرتے تو ایک عجیب قسم کی لہر اسے اپنے رگ و پے میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی اور ایک عجیب قسم کی توانائی اور لذت سے اسے اپنا نو خیز جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر اس کی ٹانگوں میں یک دم حرکت آ جاتی اور وہ دوڑ کر اپنے گھر کی چھت پر چڑھ جاتا اور جب تک جہاز نظر آتے وہ انہیں دیکھتا رہتا اور جب جہاز دور کہیں فضا میں گم ہو جاتے تو اس کی نظر محاذ کی جانب اٹھ جاتی۔ وہ محاذ پر فوجی جوانوں کو لڑتے ہوئے حملہ کرتے ہوئے اور دشمن کو پچھاڑتے ہوئے دیکھتا تو اس کے تمام جسم میں ایک سنسناہٹ دوڑ جاتی۔ مگر یہ سب تو اس کو خیال ہی خیال میں نظر آتا۔ کیونکہ محاذ اس کے گاؤں سے کئی کوس کے فاصلے پر تھا۔ یہ تیسرا روز تھا۔ جب وہ صبح ہی صبح اٹھا اور ناشتہ کرنے کے بعد کھیتوں کے بھانے گھر سے نکل گیا۔ کھیتوں سے پرے جا کر اس نے فوجی وردی پہنی جو اس کے بڑے بھائی کیپٹن ارسلان کی تھی۔ جو ملکی دفاع کے لیے کہیں محاذ پر گیا ہوا تھا۔ وہ ماں کی آنکھ بچا کر یہ وردی لایا تھا۔ پہلے تو اس نے ہاتھ سے اس کی سلوٹیں کھم کرنے کی کوشش کی اور پھر پہن کر تن کر کھٹا ہوا گیا، اور ایک تنقیدی نظر خود پر ڈالی۔ ایک لذت انگیز توانائی کی لہر اسے اپنے بازوؤں میں چلتی ہوئی

محسوس ہوئی اور اسی لذت و سرشاری میں اس کے قدم محاذ کی جانب اٹھنے لگے۔
 آج تک اس نے جنگ کے بارے میں سنا تھا۔ مگر اپنی آنکھوں سے جنگ
 دیکھنے والے نہیں دیکھی تھی۔ اس نے کتنے ہی خاکے سوچے تھے مگر ہر خاکہ وہ خود ہی
 مسترد کر دیتا۔ 'بھلا جنگ کی طرح تصور ہوتی ہے' اور پھر نئے زاویے سے اس کے
 بارے میں سوچنے لگتا۔ جوں جوں فاصلہ طے ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آرہی
 تھی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اب تو اس نے بازو بھی
 پورے جوش سے چلانے شروع کر دیئے تھے۔ بالکل فوجی جوانوں کی طرح۔ کہ جب وہ
 پریدہ کرتے ہوئے ایک قوت سے بازو چلاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ بازو اور
 پاؤں ملاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلتے جاتے ہیں۔ بس فوجیوں کو اس نے اسی
 حد تک دیکھا تھا۔ پتہ نہیں ہر فوجی کے چہرے پر اس کے بھائی کا چہرہ کیوں ابھر آتا
 تھا۔

وہ مسلسل چلتا رہا اور گرد و پیش میں حد نگاہ تک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کہیں بھی جنگ
 کے آثار نظر نہ آئے۔ بہتہ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ فوجی جیپ یا فوجی ٹرک گزر جاتا۔
 تو کافی دیر تک فضا میں گرد معلق رہتی۔ اس گرد میں اسے مختلف شکلیں نظر آتیں۔
 بہت سارے آرمی کے جوان خاکی وردیاں پہنے محاذ آرائی میں مصروف نظر آتے۔ مگر یہ
 اتنی دیر ہی ہوتا جتنی دیر گرد فضا میں معلق رہتی۔ جب فضا صاف ہو جاتی تو پھر حد نگاہ
 تک سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے کچھ نظر نہ آتا۔

علی نے آج تہیہ کیا ہوا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو وہ ضرور جنگ کے مناظر اپنی
 آنکھوں سے دیکھ کر لوٹے گا۔ اور اگر ممکن ہو وہ بھی ضرور اس میں حصہ لے گا۔ مگر جوں
 جوں وقت گزر رہا تھا۔ مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ اب تو اسے فوجی جیپ میں بیٹھے
 اعلان کرنے والوں پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

وہ گاؤں سے بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر ابھی تک دور دور جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی

اسے اتنے ہی وقار سے اٹھ کر کیپٹن ارسلان کے گھر کی جانب چلنے لگے۔
 باہر گلی میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی فوجی بوٹوں کی آواز سن کر کیپٹن ارسلان کی ماں باہر
 ڈیوڑھی تک سٹی اور صندوق دیکھ کر ایک لمحہ میں سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔
 ارسلان کا والد تو کمال ضبط کا انسان تھا۔ اس نے صندوق کو خود ہی سارا دے کر گھر
 کے صحن میں ایک چارپائی پر رکھی۔ البتہ ارسلان کی ماں کی آنکھوں سے چند آنسو نکلے اور
 رخسار پر سے راستہ بناتے ہوئے خاکی زمین میں جذب ہو گئے۔

ساڑھے تین گھنٹے کے بعد جب ٹرک میں بیٹھ کر فوجی جوانوں نے آخری نگاہ گاؤں پر
 ڈالی۔ تو اس زمین پر کیپٹن ارسلان کا نشان محض مٹی کی ایک دھیری کی شکل میں رہ گیا
 تھا۔ شام کے بڑھتے ہوئے سائے اور بھی لمبے ہوتے چلے گئے اور غلی کی ماں کے
 خدشات اور بھی تنومند ہو کر اس کے گھر کے صحن میں ناچنے لگے۔ وہ پہلے تو برآمدے
 سے صحن میں آئی اور پھر ڈیوڑھی سے لگ کر بیٹھ گئی۔

ابھی اندھیرا اتنا نہیں پھیلا تھا۔ کافی فاصلے تک چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ جب علی
 گلی کا مور کاٹ کر اپنے گھر والی گلی میں داخل ہوا۔

خاکی وردی میں مسوس خلی کو دیکھ کر اس کی ماں کو یوں لگا۔ جیسے ارسلان آ رہا ہو۔ ایک
 کے لیے اس کا دھینا ارسلان کی طرف چو گیا۔ سرد سے لودغ مورتے ہوئے وہاں سے
 مذاق ہی مذاق میں کہتا تھا۔ ہاں۔ سحری بارش لو۔ پھر کیا پتہ تمہارے بیٹے کو کچھ بھی لگا
 سکو کی باتیں۔ ورنہ یہ سن کر میں دیتی کہ یہ کل اس طرف کی بات محض دھیر سارا پیار
 بیٹے کے لیے کرتا ہے۔ مگر سے کیا پتہ تھا کہ وہ واقعی سچ کہتا تھا۔ کہ وہ اس سے کچھ بھی
 نہیں کہے کی ورنہ اس سدا میں۔ کئے شیشے میں سے سرف اس کو چہرہ ہی دیکھ سکے گی۔

علی کی سہیلیں، اعلیٰ بن آجی، ان کے کچے میں ہانسیں ڈالتے ہوئے تھیں۔
 ان فوجی سب میں احمدان لڑے والے آرمی کے جوان جھوٹ کھتے ہیں کہ سرحدوں پر
 ایک جہاد میں لڑتی ہے۔ تھوڑی سی جہاد میں لڑتی ہے۔ میں آجی سر تک ہو لے گی۔

ہوں مگر مجھے کہیں بھی جنگ تو کیا آرمی کے جون بھی نظر نہیں آئے۔۔۔۔۔

بال ماں میں بالکل سچ کہتا ہوں۔۔۔۔۔ میں خود نہر تک ہو کے آیا ہوں۔۔۔۔۔

نعی کی ماں تو زبان سے کچھ نہ بولی۔ اس نے اسے پیٹا لیا۔ اور خوب پیار کرنے لگی۔ البتہ اس کے والد کے منہ سے صرف اتنا نکلا بیٹا جنگ دیکھنے کے لیے محاذ پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو خود چل کے ہمارے گھروں تک آجاتی ہے۔

جنگ خود چل کے ہمارے گھروں تک آجاتی ہے۔ اس نے اس کے بارے میں بہت سوچا مگر بات سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے ماں سے بھی پوچھا مگر وہ بھی اس کی کٹلی نہ کر سکی۔ بلکہ وہ تو منہ سے بھی کچھ نہ بولی۔ البتہ اس دن کے بعد سے وہ روزانہ ریلوے اسٹیشن جاتا ہے وہ شہر سے آنے والی آخری گاڑی تک منتظر رہتا ہے اسے پورا یقین ہے کہ جب اس کا بھائی کیپٹن ارسلان گھر آئے گا۔ تو وہ ضرور اس بات کی وضاحت کر سکے گا کہ جنگ کیسے چل کر ہمارے گھروں تک آجاتی ہے۔

(۶- ستمبر ۱۹۹۰ء)



دیوار پہ لٹکا ہوا آدمی

اپنے کمرے میں بید پر لیٹے ہوئے عام طور پر جو دیوار میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اس پر ایک درمیانے سائیز کا پوسٹر آویزاں ہے۔

پوسٹر کیا ہے۔ بس سیاہ اور سفید رنگ کے باہمی تضاد سے ایک تاثر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی نظر دیکھنے سے پوسٹر کے منقش کردہ مفہوم تک رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

پوسٹر پر بیلوں کی ایک جوڑی ہے اور ایک کسان ہے جس نے بل جوتا ہوا ہے۔ برٹنی عام فہم اور عمومی سی تصویر ہے اور یقیناً جب میں نے اسے خریدا تھا تو میرے لشعور کے کسی گوشے میں اس کے مضامیم پسند ہوں تو مجھے خبر نہیں۔ البتہ جس قدر معنی خیز اور فکر انگیز یہ پوسٹر اب ہو گیا ہے۔ یقیناً پہلے ایسا نہیں تھا۔

میں نے ایک اسے 'کائناتس فاسٹ پارٹ' میں جب داخلہ لیا تھا۔ تو بائٹل میں یہ کمرہ مجھے ملے تھا۔ ضروری سامان کو کمرے میں مختلف جگہیں دینے کے بعد یہ دیوار رہ گئی تھی۔ میں یہاں پوسٹر لگانے کے بارے میں ہرگز نہ سوچتا اگر اس سے پہلے یہاں تصویر نہ لگی ہوتی۔ جانے والے نے جب وہ تصویر اتاری تھی تو کچھ جگہوں سے ڈسٹسپراکٹ کر دیا تھا۔ جو بہت برا نہ لگتا تھا اور اس مسئلے کا جو حل میرے ذہن میں فوری طور پر آیا تھا۔ وہ

دریافت ہوتے چلے گئے اور پھر ایک وقت ایسا آیا۔ جب سب لوگوں کے لیے یہ منٹ ایک عام سا پوسٹر بن کے رہ گیا۔

مگر میرے لیے اس لمحے پر اس کے نئے مضامین کھینے شروع ہو گئے۔ میں کمرے میں جب بھی بیڈ پر لیٹتا۔ میری نگاہ اس پر چمکتی دور کئی کئی لمحوں میں اس مسئلہ کو زندہ ہر لمحہ محسوس کرتا۔ آہستہ آہستہ مجھے زندگی کے تمام رویے اس پوسٹر میں جھلکتے محسوس ہونے لگے۔ بیویوں کے باہمی تعاون اور کسان کے بل پونے کا عمل مجھے زندگی سے بہت قریب لگنے لگا۔ کبھی کبھی تو یہ درمیانے سائیز کا پوسٹر پھیل کر میرے کمرے کے کونے کونے میں لپیٹ لیتا اور میرے کمرے سے سڑکی کی خوشبو آنے لگتی۔ جیسے ابھی ابھی بل چلا یا گیا ہو۔

کسان کی مسئلہ منہ جی اور مشقت نے مجھے مسلسل محنت اور ریاضت کا درس دیا۔ جوں جوں یہ مضامین مجھ پر کھلے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کتابوں سے باہر نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھ رہا ہوں۔ مجھے زندگی کے نشیب و فراز کی سمجھ آنے لگی ہے۔

ورپہ تو باقاعدہ میں نے اس کی تبلیغ شروع کر دی۔ میرے دوستوں میں سے سب بھی کوئی میرے کمرے میں آتا تو میں اس کی توجہ اس جانب نہ دلاتا، مگر اکثر و بیشتر مجھے کھنکھاتا۔ بننا پڑتا اور میری بات پر کوئی کان نہ دھرتا۔

مجھے یہ تصویر عمل و حرکت کا احساس دلاتی۔ زندگی کو درپیش ہمارے جیسے مسائل کا نہ صرف احساس داتی بلکہ ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتی۔ میں اس تصویر کو دیکھ کر کچھ کر کرنے کے ولولے دس میں کروٹیں لیتے ہوئے محسوس کرتا۔ میرے خون کی گردش تیز ہو جاتی اور مٹھیاں بھینچ کر بہت کچھ کر کرنے کے پروگرام بنا ڈالتا۔

میں نے مار باپا کہ دوستوں کو بھی اس کیفیت میں شامل کر سکوں۔ مگر وہ کبھی بھی اس بارہ میں نہ بہہ سکے۔ اس پوسٹر کو دیکھ کر کبھی بھی اس کے چہروں پر کچھ کر کرنے کے تاثرات نہ پیدا ہوئے۔

فرسٹ پارٹ میں جب میں نے ٹاپ کیا۔ تو اپنے آپ کو اپنے خوابوں کی تعبیروں کے بہت قریب پایا اور میں نے اسی جوش و خروش میں سینڈ پارٹ کا امتحان دے ڈالا۔ کمرہ خالی کرنے کا وقت آیا۔ تو میں نے جہاں دیگر اہم اشیاء کو سمیٹا۔ وہاں اس پوسٹر کو بھی دیوار سے اتارا اور اپنے سامان میں رکھ لیا

اور پھر میری زندگی کا اہم دور شروع ہوا۔ مجھے وہ پہلا دن یقیناً اگلے کئی برسوں تک بھی نہ بھولے گا جب میں شیو ساربا تھا اور اپنی زندگی کا پہلا انٹرویو دینے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میرے کمرے کی دیوار پہ وہی پوسٹر لگا ہوا تھا اور شیو ساربا نے جوئے میری نظر اس پر پڑ جاتی تو رگوں میں خون کی گردش اور بھی تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔

اور پھر ایک سے دوسرے تیسرا اور پھر بیسیوں انٹرویو دے ڈالے۔ ہر انٹرویو پہلے دن کے سے جوش و خروش سے تیار ہو کر دینے کے لیے جاتا۔ مگر واپسی پر پاؤں سو سو من وزنی ہو جاتے۔ گھر تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ پتہ نہیں انہیں کس طرح کا شخص درکار ہوتا تھا۔ میں کسی ایک کے معیار پر بھی پورا نہ آتا۔

مگر اس کے باوجود یہ پوسٹر ہر مرتبہ از سر نو میری ہمت بندھاتا اور ایک نئی آس کا دھپک جلاتا۔ ہر مرتبہ مجھے میں پہلے دن کا ماحول ملتا اور غم پیدا ہو جاتا۔ مگر اب تک۔۔۔۔۔ آخر کب تک ایسا ہوتا۔

آہستہ آہستہ تمام خواب ٹوٹنے شروع ہوئے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل کب شروع ہوا اس کے بارے میں لائن کھینچنا ممکن نہیں۔ عجیب عجیب احساسات نے میرے اعصاب کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا اور پھر تو یوں بولنے لگا۔ کہ میں انٹرویو دینے سے ہی لاپرواہی برتنے لگا۔ اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک دلیل میرے پاس موجود تھی۔ ہر انٹرویو کا نتیجہ مجھے پہلے سے ہی معلوم ہوتا۔

وقت گزارنے کے لیے میں نے ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچنگ شروع کر دی تھی صبح کے چند گھنٹے جو سکول میں گزرتے۔ وہ تو ایسے پیسے کٹ جاتے۔ مگر سکول سے

وہیں گھم آ کر وقت کا ٹپا پار کاٹنے کے مترادف ہو جاتا۔ کئی کئی گھنٹے تک سگریٹ پہ سگریٹ سلاگے بید پر پڑا رہتا۔ سامنے دیوار پر ٹنگی تصویر بھی اب تو اپنا منہ مٹھو بیٹھی تھی۔

پتہ نہیں اس عمل میں کتنے مہینے گزر گئے۔۔۔۔۔ کتنے سال گزر گئے اور یا پھر شاید کئی صدیاں گزر گئیں۔

در پھر ایک روز زوردار چھٹکا ہوا۔ پوسٹر پر سیاہ و سفید کے تضاد سے پیدا کیا جانے والا اثر ایک مرتبہ پھر معنی خیز ہو گیا۔ البتہ اب اس کا منہ بدل گیا تھا۔ بیلوں کی جوڑی جو باہمی یگانگت اور تعاون کی علامت تھی۔ ایک دم یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ بیل اپنے گلے میں پنجالی ڈالے زمین کا سینے چیرتی بل کو کھینچنے کے لیے پابند ہیں اور ہر صورت انہیں یہی کرنا ہے۔ کسان جس کے چہرے سے عزم و ارادے کی لو پھوٹتی تھی ایک دم بے بس اور لاچار سا نظر آنے لگا۔ جیسے وہ اس عمل کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ مگر کوئی غیر مافی قوت۔۔۔۔۔ یا خدا میں گھورتی ہوئی دو خوفناک آنکھیں اسے مجبور کر رہی ہوں۔ وہ اپنے ارد گرد آگ آنے والی ضرورتوں کو کاٹنے کے لیے مسلسل بل چد رہا ہے۔ مگر اس دھرتی کا سینے چیر کے بھی وہ ناکام و نامور رہتا ہے۔

پوسٹر کے اس بدلتے ہوئے منہ نے مجھے اعصابی طور پر بہت لاغر اور توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہی تصویر جو کبھی دل میں کچھ کر گزرنے کے ولولے بیدار کرتی تھی۔ جسے دیکھ کر رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اب میں لاغر اور پیلہ ہوتا جا رہا تھا۔

در پھر پتہ نہیں وہ کون سا لمحہ تھا۔ جب میں نے پوسٹر کی جگہ دیوار پر اپنے آپ کو لٹکا ہوا محسوس کیا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹ پڑیں بعد یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں چارپائی پر لیٹے ہونے کے بجائے دیوار پر ایک بے جان پوسٹر کی طرح لٹکا ہوا ہوں۔

مگر دو چار بار اپنی پلکیں جھپکنے کے بعد مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں واقعی دیوار پر ٹکنا
 ہوا ہوں اور میرا ہیڈ بالکل خالی پڑا ہے۔ جیسے کسی کے سنے کا منتظر ہو۔ جو آکر میری
 طرف توجہ دے گا اور میرے بکھرے ہوئے غیر واضح خدوخال کو اپنی توجہ اور یکسوئی
 سے پوری جسامت بخٹے گا۔

(ستمبر ۱۹۹۰ء)



گلی کا موڑ

برمی سڑک سے اتر کر گلی کا موڑ کاٹنے سے قبل میں نے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ وہیں تھی ٹیرس پر ریلنگ کے قریب ایڑی چیسر پر بیٹھے ہوئے۔ اور اس نے نگاہیں سامنے کھیل کے میدان پر لگائی ہوئی تھیں۔ جہاں شام مچنے کے پچھلے کود کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔

دو کمال کے اماٹے میں واقع اس کی کوٹھی اب بھی برمی رعب دار لگتی تھی کیونکہ ارد گرد مچنے کے چار چار چھ مڑوں پر بنے جزوی طور پر پختہ مکانوں کی حیثیت ہی کیا تھی مچنے کے لوگ اسے کوٹھی والی بیگم صاحب کہتے تھے۔ البتہ اس کا اصل نام بیگم لاس تھا اس وقت ہم لوگ بہت چھوٹے تھے، میں پرائمری کی کسی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب ان لوگوں نے مچنے سے باہر یہ جگہ خریدی تھی۔ اس وقت یہ زمین کھلے میدان کی طرح غیر آباد برمی ہوئی تھی۔ زمین خریدنے کے بعد جلد ہی وہاں لوگوں نے یہ کوٹھی تعمیر کروائی تھی۔ اس وقت تک سامنے سے پختہ سڑک بھی نہیں گزرتی تھی۔ مگر جب سامنے پختہ کھلی سڑک بن گئی کوٹھی کا بیرونی منظر اور بھی رعب دار ہو گیا۔

کئی برس گزر جانے کے باوجود آج بھی ان لوگوں کے مچنے والوں کے ساتھ کوئی خاص تعلقات نہیں بن سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یقیناً یہی تھی کہ دونوں طرف سے کبھی

کوشش ہی نہ ہوئی تھی۔ اور یوں سٹیٹس کا فرق ہمیشہ قائم رہا۔ محلے کی ہی کوئی نہ کوئی عورت مختلف وقتوں میں اس کوٹھی کے مکینوں کے ہاں دروست کرتی رہی۔ جس کے باعث ان کے بارے میں تصورِ بہت علم ہوتا رہتا۔

ہم لوگ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اور کوٹھی سے ملحقہ گراؤنڈ میں کھیلتے تھے۔ پہلے پہل جب کوٹھی تعمیر ہوئی تھی تو اس کے گرد چار دیواری نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ہم لوگوں کو کوٹھی کے ایک طرف کھیلنے کے لیے جگہ مل جاتی تھی۔ اب جہاں کھیل کا میدان ہے وہاں کبھی پانی کا جوہڑ ہوتا تھا۔ سکول سے آنے کے بعد شام محلے کے بچوں کی ایک ہی مصروفیت ہوتی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس میدان میں کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتے رہتے۔ جب کوٹھی کے مکینوں نے یہ جگہ خرید کر ایک حصے میں کوٹھی بنالی تو بھی محلے کے بچوں نے یہ کھیل کو دیواری رکھی۔

پہلے پہل تو کوٹھی والوں کا نوکر آکر منع کر جاتا تھا کہ شور نہ کریں پھر یوں ہوا کہ بچوں کو سختی سے کھیلنے سے منع کر دیا گیا، مگر چونکہ اور کوئی جگہ نہ تھی اس لیے مجبوراً سچے بچہ او حری اکٹھے ہو جاتے۔

کوٹھی کے مکینوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ اپنے احاطے کے گرد چار دیواری کھڑی کر دی۔ اور یوں محلے کے بچوں کے کھیلنے کے لیے اب کوئی جگہ نہ بچی۔ میں نے شروع سے ہی ان کوٹھی والوں کے بارے میں ذرا مختلف انداز میں سوچا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ اس چار دیواری کی تعمیر نے تو میرے اندر اور نفرت بودی تھی۔ میں دل سے مانتا تھا کہ یہ احاطہ چونکہ کوٹھی والوں کی ملکیت تھا لہذا چار دیواری ان کا حق بنتا تھا مگر پتا نہیں کیوں کوئی میرے اندر چھینتا تھا کہ یہ چار دیواری صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ محلے کے بچے یہاں آکر نہ کھیلیں۔ اس حساس کی وجہ صرف یہ ایک بات نہ تھی کئی اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنہوں نے مل کر مجموعی طور پر ایک بڑی نفرت کو جنم دیا تھا۔

ان دنوں محلے کے قریب ایک ہی اسکول تھا جس میں محلے کے بچے بھی پڑھتے تھے اور کوٹھی والوں کے دو بچے بھی تیسرا ابھی چھوٹا تھا۔ ان میں سے بڑا لڑکا تو میرا ہم جماعت تھا۔ ذیق صرف اتنا تھا کہ وہ کلاس میں سب سے آگے بیٹھتا تھا اور میں پیچھے۔ کلاس ٹیچر کا رویہ اس کے ساتھ اور میرے ساتھ قطعی مختلف تھا اور یوں جو فاصلہ محلے میں رہتے ہوئے قائم تھا۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہوئے بھی وہ فاصلہ بدستور قائم رہا اور نفرت کا بیج بھلتا چھوٹا رہا۔

صبح جب اسکول جانے کے لیے میں محلے کے دیگر بچوں کے ساتھ بستہ اٹھانے نکلتا تو کوٹھی کے سامنے ایک تانگے والا موجود ہوتا۔ جو کوٹھی والوں کے بچوں کو اسکول لے جاتا اور لے آتا۔ بچے صرف دو تھے اور پورا تانگہ۔ کئی بار تو میں نے سوچا، کہ چلو میرا بستہ ہی تانگے میں رکھ کر لے جائیں۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ اپنے بوجھ اپنے سروں پر اٹھائے محلے کے چند لڑکے کلچ میں داخل ہوئے تو ان میں ایک میں بھی تھا اور کوٹھی والوں کا بڑا بیٹا بھی۔

اور یہی وہ دن تھے جب کوٹھی کی رونق میں اضافہ ہوا تھا۔ محلے کی ملازمہ کے توسط سے پتا چلے کہ ان کے ڈیڈمی آئے ہیں۔ یہ ڈیڈمی لندن سے آئے تھے اس اظہار نے ہمارے درمیان فاصلوں کی خلیج اور بھی بڑھا دی۔ اور جب ڈیڈمی گئے تو جاتے ہوئے دونوں بڑے بیٹوں کو بھی تعلیم کے سلسلے میں ساتھ لے گئے۔ اب صرف چھوٹا رہ گیا تھا۔ جو ابھی پرائمری سے نکل کر ہائی سکول میں قدم رکھ رہا تھا۔ محلے کی ملازمہ نے ہی بتایا کہ بہت جلد اسے بھی ڈیڈمی ساتھ لے جائیں گے۔ ابھی چونکہ بیگم صاحبہ اکیلی تھیں اس لیے چھوڑ گئے ہیں میں نے گریجویٹیشن کے بعد ایک مقامی دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ کہ اب نہ صرف مجھے گھر کی کفالت میں ہاتھ بٹانا تھا بلکہ اپنا بوجھ بھی خود ہی اٹھانا تھا اور اسی دوران میں نے ایم اے کر لیا۔ اور یوں ایک بہتر دفتر میں ملازمت مل گئی جہاں میرا اپنا کمرہ تھا میز تھی اور کرسی تھی اور یہ احساس میرے لیے اطمینان بخش تھا۔

میں محلے کے اسی مکان میں اپنی ماں بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا بڑا بیٹا محلے کے اسی پرائمری سکول میں پڑھتا ہے۔ جہاں کبھی میں پڑھتا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ اب اسکول کی عمارت کی دیواریں اور فرش پختہ ہیں اسکول کا ایک گیٹ ہے اور اس پر اسکول کا نام لکھا ہوا ہے اور یہ سب پہلے نہیں ہوتا تھا۔ پرائمری سکول کے بعد ہائی سکول میں داخل ہو جانے پر میں سوچ رہا ہوں کہ اسے سائیکل لے کر دوں گا۔ کوٹھی والی بیگم کے تینوں بیٹے پڑھ لکھ کر بڑے افسر بن چکے ہیں۔ بڑے لڑکے نے انجینئرنگ کی تھی اور وہ ملک میں ہی ایک دوسرے شہر میں اسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گیا ہے۔ اس سے چھوٹا لندن میں ہی ملازمت کرتا ہے۔ جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا سرجن ہے۔ پاکستان میں رہنا چاہتا تھا مگر چند مہینوں کے بعد اچانک ہی وہ لندن واپس چلا گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تینوں بھائیوں کی شادیاں خوب ٹھاٹھاٹ سے ہو چکی ہیں۔

محلے والوں نے تو صرف چھوٹے بیٹے کی شادی کے ٹھاٹھاٹ دیکھے تھے۔ باقی دونوں کی شادیاں پتا نہیں کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں لیکن یقیناً ٹھاٹھاٹ سے ہوئی ہوں گی۔ زندگی کی شاہراہ پر بیگم الماس اکیلی رہ گئی ہیں۔ دو سال ہوئے ہارٹ اٹیک نے ان کے خاوند کو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا۔ اور ان کے بیٹے جو کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں اپنے اپنے گھروں میں خوش باش ہیں اور کوٹھی والی بیگم صاحبہ روزانہ ٹیرس پر رینگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھ جاتی ہیں اور انتہائی انہماک سے اس کھیل کے میدان کی طرف دیکھتی رہتی ہیں جہاں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں جن میں میرا بڑا بیٹا عرفان بھی شامل ہے۔

ابھی ابھی میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ اس مرتبہ کوٹھی والی بیگم صاحبہ نے انہیں فٹ بال خرید کر دیا ہے اور کہا ہے کہ آئندہ بھی جب انہیں نئے فٹ بال کی ضرورت پڑے تو آکر اس سے کہہ دیں۔

یہ الفاظ مجھے چوکاٹنے کے لیے کافی ہیں۔ میرے اندر ایک لمحے کے لیے نفرت کا شدید احساس جنم لیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ عرفان کو فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر چپ رہ جاتا ہوں کہ بیگم الماس کھیتے ہوئے بچوں میں اپنے بچوں کا بچپن تلاش کرتی ہیں جو انہوں نے اپنے بچوں کے بستر مستقبل کے لیے کہیں راستے میں گنوا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے روکتا ہے کہ میں وہ نفرت جو میرے دل میں پروان چڑھی ہے۔ اسے اپنے بیٹے عرفان کے دل میں نہ بوؤں کہ وہ ساری زندگی اس لپیٹ میں رہے گا۔

ہاں۔۔۔ اتنا ضرور ہے کہ جب میں گلگی کا موڑ کاٹتا ہوں تو اس سے پہلے ایک بار ضرور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے اگرچہ علم ہے کہ وہ ٹیرس پر ریلنگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھی نہماک سے مسیحا ان میں کھیتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ موڑ مڑنے سے قبل آخری مرتبہ دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سا لذت انگیز احساس سرسراٹے لگتا ہے اور میں عجیب سا اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہوں۔

(اپریل ۱۹۹۱ء)

فن کار

اسے ہمیشہ سے یہ گھد رہا ہے کہ لوگ اس کی مہارت اور صلاحیتوں کو جاننے میں بہت دیر کر دیتے ہیں اتنی دیر کہ جب اس کا دل کام کرنے سے اکتانے لگتا ہے تو لوگوں تک اس کے کام کی مہارت کا شہرہ پہنچتا ہے اور وہ باوجود ان کے اصرار کے بھی اپنا پیشہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، کہ یہی اطمینان کی ایک صورت نظر آتی ہے۔

اس نے کسی تدریسی ادارے سے نہ تو کسی خاص شعبے میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی کسی تکنیکی ادارے سے کوئی کام سیکھنے کا باقاعدہ ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ اس کے باوجود بقول اس کے اس نے جس کام پر بھی توجہ دی اپنی مسلسل محنت اور لگن سے بہت کم عرصہ میں اس نے اس میں خاطر خواہ مہارت حاصل کر لی اور اس مخصوص شعبہ میں استاد کا درجہ پایا کہ یہی وقت کی سند قرار پائی ہے۔

اس کا والد گاؤں میں منجھی پیر مٹی ٹھونکنے کا کام کرتا تھا۔ بہت بھولا بھال، ناک کی سیدھ میں سفر کرنے والا اور سفر بھی ایسا کہ دائیاں پاؤں اٹھے تو باتیں کو خبر نہ ہو اور باتیاں پاؤں اٹھے تو اس کی دھول دائیں پاؤں پر نہ پڑے اس قدر سادہ کہ اس نے کبھی گھر سے دوکان اور دوکان سے گھر آنے جانے کے علاوہ مہینوں تک کچھ اور نہ کیا، کہیں

اور نہ گیا۔

کہتے ہیں کہ کبھی کوئی گاہک اس سے مایوس نہیں گیا جب بھی کوئی مسئلہ لے کر آیا تو اس کے والد نے اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالا، لوگوں کو اس کے بارے میں یہی علم تھا اس کے علاوہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو بھی کھلا ہوا نہیں تھا کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے علاوہ اس کی شخصیت میں کچھ تھا ہی نہیں دوکان کا مالک اگرچہ بہت ہوشیار آدمی تھی مگر گاؤں کی محدود ضرورتوں والی فضا میں رہنے کے باعث اس کے دل میں خدا ترسی بھی بھری ہوئی تھی

کتنے ہی سال بیت گئے اس کے والد کو منجھی پیر طحی ٹھونکتے ہوئے، اس سے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا مالک کو یاد پڑتا تھا کہ شاید ہی کبھی اس نے دوکان سے چھٹی کی تھی یا کام کرنے میں لاپرواہی یا کام چوری کا مظاہرہ کیا تھا البتہ اس کے کام کرنے کی اپنی ایک رفتار تھی۔ جو زمانوں سے نہ تو کم ہوئی تھی اور نہ ہی زیادہ، عید سعید کے موقع پر اگر مالک اسے دو چار دن کی اجرت بونس کے طور پر دے دیتا تو بھی اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آتی تھی اس کی آنکھوں میں کبھی پسند یا ناپسندیدگی کی کوئی لہر نہیں اٹھتی تھی۔

حتیٰ کہ اپنے بیٹے کی پیدائش پر بھی اس کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ آئی وہ تو کسی دن بعد مالک کو پتہ چلا تو اس نے خود ہی سٹائی منگوا کر ارد گرد کے دوکانداروں کو اطلاع پہنچائی تھی کہ اس کا ایک اور ملازم بھی باپ بن گیا ہے۔

اس کے والد کے گھر آنے کا ایک مخصوص وقت تھا۔ شام مغرب کی اذان سے اتنا پہلے کہ وہ گھر پہنچ کر اطمینان سے اپنے سر کی پگڑی اتار کر چار پانی پہ ایک طرف رکھ دیتا۔ اس کی بیوی اس کے لیے پانی کا کٹورا لے آتی پانی پی کر وہ چند لمحے اطمینان کا سانس لیتا۔ بازو اوپر چڑھاتا اور وضو کے لیے بیٹھ جاتا۔ بعض اوقات وضو کے دوران اور بعض اوقات وضو کر چکنے کے بعد مغرب کی اذان ہو جاتی اور وہ گھر کے قریب ہی محلے کی

جامع مسجد میں نماز پڑھنے چلا جاتا۔

واپس گھر پہنچنے پر کھانا تیار ہوتا، اور وہ حسبِ خواہش چند لقمے لے کر دسترخوان سے اٹھ جاتا۔ کیا پکا ہے، مرچ یا نمک تیز ہے یا کم ہے اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

موسموں کی تبدیلی کے ساتھ شام غروب کا وقت بدلتا رہتا تھا مگر اس کی مصروفیت کا جو تعلق سورج کے غروب ہونے کے ساتھ بن گیا تھا اس میں کبھی کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ آئی تھی۔

اس پدری معاشرے میں ملاحظہ کر یہی کل رول تھا جو اس کا والد تب سے کرتا آ رہا تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کا احساس صرف سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ہو سکتا تھا کہ جب شام اس کا والد پگڑھی اتار کر چارپائی پر رکھتا۔ وگرنہ اپنے والد کے چہرے کے نقوش میں ہونے والی کسی قسم کی تبدیلی کو وہ محسوس نہ کر سکا۔

ایسے گھر میں پرورش پانے والے بچوں کا مستقبل زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا ہے وہی اس کا ہوا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جب اس کے ہاتھ بازو مضبوط ہوئے تو والد کے ساتھ دوکان پر جانے لگا۔

دوکان پر جانے کا سلسلہ بھی بالکل غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا۔ اول اول وہ گرمیوں کی دوپہروں میں والد کے لیے کھانا لے کر جاتا تھا۔ پھر اس میں تسلسل آ گیا اور وہ نہایت باقاعدگی سے دوکان پر والد کی مدد کے لیے جانے لگا۔

دوکان پر اور کاریگر بھی تھے مگر اس کے والد کی شخصیت ان سب سے مختلف تھی مستقل خاموشی نے جہاں اس کو بے شمار مساکین سے محفوظ رکھا ہوا تھا وہاں دیگر کاریگروں پر ایک طرح کا غیر مافی السحاب بھی قائم تھا۔

ایک دن دوکان کا مالک خدا جانے کس ترحم کے موڈ میں تھا اس نے اس کے

والد کو منجھی پیر بھی ٹھونکنے والے کام سے اٹھا کر چار پائیوں کے پائے بنانے والے کام پر لگا دیا۔ ترقی کے زینے کا یہ واحد مرحلہ تھا جو اس کے والد نے طویل مشقت کے بعد طے کیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسا ہو گیا تھا۔ اگر پائے بنانے والا کاریگر دوکان چھوڑ کر چلا نہ گیا ہوتا تو شاید یہ بھی نہ ہوتا۔

بہر حال چند دن کی محنت کے بعد اس کے والد نے درست پائے بنانے شروع کر دیے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس کے والد کے بنائے ہوئے پائیوں کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار بیٹیوں کے جھیز کے لیے رٹلے پائے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہی پسند کرتے۔ اس کے علاوہ دودھ بلونیاں اور دیگر گھریلو سامان جہاں گول مشین پر ترشے ہوئے اور نیلے سرخ اور پیلے رنگوں میں رنگے ہوئے پائے استعمال ہوتے تھے وہ اس کے والد کے ہاتھ کا ہی شاہکار ہوتے تھے۔

جب اس نے والد کے ساتھ دوکان پر باقاعدہ بیٹھنا اور ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا تو اس وقت تک اس کے والد کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا اور علاقے میں اس کے والد کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔

ورہی وہ دن تھے جب اسے احساس ہوا تھا کہ مالک نے اس کے والد کو جائزہ میں بہت دیر کر دی تھی۔ اگر کئی سال پہلے مالک اس کے والد کو یہ موقع فراہم کر دیتا۔ وہ بہت پہلے اس کا والد اس مقام پر پہنچ گیا ہوتا اور اب تک مزید کئی منازل طے کر چکا ہوتا۔ یہی وہ احساس تھا جس نے آکٹوپس کی طرح اس کو چاروں اور سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور بتدریج گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جلد ہی اس نے والد کے ساتھ پائے بنانے شروع کر دیے تھے۔ اور بہت جلد وہ مہارت اور سپید ہر دو حوالوں سے والد سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ لکڑی کا کٹر مشین پر چڑھا کر جب وہ اسے گھماتا تھا تو بڑے اعتماد اور کمال مہارت سے انگلیوں کا استعمال کرتا۔ اس کی آنکھ کا زاویہ اتنا تیز اور درست ہوتا کہ بغیر پیمائش کے ہی پائیوں کی

گولانیاں اور کناریاں اتنی درست ہوتیں کہ آدھے سوت کا بھی فرق نہ پڑتا اور اسی صلاحیت نے اس کے کام کی رفتار میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

مگر جلد ہی اس کام سے اس کا جی بھر گیا اس کی وجہ تو اسے سمجھ نہیں آئی البتہ زندہ رہنے کے لیے جتنے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں وہ ذاتی طور پر ان کی بے معنویت کا شکار ہو گیا تھا اور یہیں سے بے زاری اور بددلی کی جڑیں پھوٹنا شروع ہوئیں۔

دوکان کے مالک نے بہت اصرار کیا معاوضے کی بھی بہتر پیش کش کی۔ مگر اس کے ایک جھلے کے بعد مالک کا اصرار ختم ہو گیا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ اس کا دل نہیں چاہتا، نہ صرف یہ بلکہ کوئی بھی کام کرنے کو اس کا جی نہیں مانتا۔

مگر یہ کیفیت چند دنوں کی فراغت تک ہی محدود تھی البتہ اب اس نے فرنیچر بنانا شروع کر دیا تاکہ تھکے ہیں کہ جسے ایک بار لکڑی کی خوشبو کی لت پڑ جائے تو پھر وہ اس سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا شاید یہی وجہ ہو اس کے فرنیچر کی طرف لوٹنے کی۔ بہت تھوڑے سے عرصے میں وہ فرنیچر کی دنیا میں (یہ دنیا اس کے گرد و پیش میں واقع چند گاؤں تک ہی محدود تھی) ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے علاقے کے اثرورسوخ والے خاندانوں کے گھروں میں نت نئے ڈیزائن پہنچا کر خاصی شہرت حاصل کر لی تھی اور علاقے کے لوگوں کے گھروں میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جہاں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہ ہو۔

لکڑی نو بھیننے اور زندہ لکڑی سے پہلے ہی وہ اس کی سطح پر بننے والے لہریوں کو پہچان لیتا تھا وہ ہر گزسی میز شوکیس میں لگنے والی لکڑی پر اُبھرنے والے ریشوں کا ایسا انتخاب کرتا۔ دیکھنے والوں کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔

بداقت میں جو فرنیچر بنتا تھا اس میں مختلف انواع کی گھکاریاں ہوتی تھیں مگر اس کے ہاتھ سے بننے والا فرنیچر بہت سادہ مگر بہت دلکش ہوتا تھا۔ وہ اکثر کھتا لکڑی کا اپنا ہی اتنا حسن اور دلکشی ہے کہ اس پر ہونے والی یہ گھکاریاں کسی طور مناسب نہیں لگتیں۔ وہ

فرنیچر میں استعمال ہونے والی کڑھی کے کناروں پر اور اس کے تناسب میں ہی پتہ نہیں کیا جادو جگا دیتا کہ آنے والا کچھ نہ کچھ ضرور خرید لے جاتا۔

مگر اس سارے عمل میں سے کئی سال لگ گئے۔ اس کے اندر ایک مسئلہ بے چینی نے گمہ کر لیا تھا۔ لوگ یقیناً میری مہارت اور فن کو جاننے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور جب وہ سمجھنے لگیں گے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

یہی وہ احساس تھا جس نے اسے کئی دنوں سے ڈسٹرب کیا ہوا تھا۔ اور اس کا جی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک روز شاید انہی سوچوں میں غلطیاں پیش فرنیچر بنا رہا تھا۔ جب اس کی انگلی کٹ گئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ کے انگلوٹھے سے کٹے ہوئے زخم کو دبا دیا اور پنساری کی دکان کی طرف چل پڑا۔ اور پھر وہ کبھی اپنی ورکشاپ میں نہیں گیا۔ وہاں اب بھی اس کا شاگرد کام کرتا تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ انگلی کا زخم بھی مند مل ہو چکا تھا۔ مگر نشان مسئلہ رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن وہ اپنے دوست کی مٹائی کی دوکان پر بیٹھتا۔ سارا دن خوب گپ شپ ہوتی۔ سیاست کے اتار چڑھاؤ اور مذاکات کی سودے بازیوں پر خوب بحثیں جھڑپیں۔ مگر یہ سب اس وقت تک تھا جب تک الیکشن نہیں ہوئے تھے۔ الیکشن ہونے کے بعد عوام کے منتخب نمائندگان ملت برداری کی قہرب سے فارغ ہو کر اپنے لیے آئین کے مطابق وزیراعظم کا انتخاب کر چکے تھے۔ اگلے چند ہفتوں کے بعد ہی سیاسی موضوعات پر گرا کر بحث ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی اور حکومتی سرگرمیاں معمول پر آ گئیں۔

اب جو فست ملی تو دھیان مٹائی کی طرف پل گیا اور وہیں دوست کی دوکان پر ہی مٹائی بنانے لگا۔ اس کی مسلسل محنت اور نئے نئے تجربات کی عادت نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اور پھر اندھے میں جہاں بھی خوشی کا موقع آتا۔ چار لوگ مل بیٹھتے، تو اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹائیوں کی لذت کا ذکر ضرور ہوتا۔

ساتھ ہی ایک سائیکل والے نے دوکان چھوٹی تو اس نے کرائے پر لے لی اور پھر آزادانہ طور پر اپنا کام کرنے لگا۔

ارد گرد کے سبھی گاؤں تک اس کا شہرہ پہنچا۔ جہاں پر بھی شادی و مسرت کا لمحہ ہوتا اس کو ضرور یاد رکھا جاتا۔ بلکہ ایسے مواقع کے لئے خصوصی طور پر مٹائیاں بنوائی جاتیں۔ اسی طرح اس نے مختلف نوعیت کے تجربات کے بعد حونسی نئی مٹائیاں بنائی تھیں تو خود ہی ان کے اٹے سیدھے نام رکھنا شروع کر دیئے تھے۔ مثلاً برفی اور کھوئے کو ملائے سے اس نے ایک تیسری چیز بنائی تھی جس کا نام اس نے برکھویا رکھا تھا۔ اس کی شکل بظاہر تو برفی کی گلیوں کی طرح ہوتی تھی۔ مگر دونوں ذائقے علیحدہ علیحدہ محسوس ہوتے تھے اور کھانے والے کو اندازہ نہ ہو پاتا تھا کہ انکا نوالہ برفی کا ہے یا کھوئے کا۔ اسی طرح سردیوں کے موسم میں وہ اس میں گاجر کا حلوہ کس کر دیتا تھا۔ اس کا ایک الگ اپنا ذائقہ بن جاتا۔ اس کے ٹکڑے نسبتاً بڑے کئے جاتے تھے اور اس کا نام اس نے گجرفی رکھا ہوا تھا۔ گجرفی کی رنگت میں کہیں کہیں گاجر کی سرخی اس کو دیکھنے میں بھی پر لطف بنا دیتی تھی۔

جلیبی کا خاص موسم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب میلوں ٹیلیوں کے دن ہوتے تھے وہ تمام تر ساز و سامان کے ساتھ میلے کے مقام پر شفٹ ہو جاتا اور تازہ تازہ جلیبی میلے کے شائقین کی خدمت میں پیش کرتا اور جس روز کیدھی جوتی یاد نگل ہوتا وہ روز تو اس کی دیہاڑی کا انتہائی آمدن والا دن ہوتا تھا۔ لوگوں نے اب کی بار اس کو اور اس کی مٹائیوں کو خوب خوش آمدید کہا تھا اور اسے مناسب وقت کے بعد ہی شہر اور عزت ملنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیوں اس کا جھنڈ بیکری کی اشیاء کی طرف ہو گیا۔ تازہ تازہ بند جب وہ تیار کرتا تو دس دکان دکان بائیں تک اس کی میٹھی میٹھی خوشبو جاتی تھی۔ بسکٹوں کے ڈیزائن میں تو اس نے انتہاء ہی کر دی تھی۔ شکل اور ذائقے، ہر دو حوالوں سے ایسی ایسی خوش ذائقہ اور لذت انگیز چیزیں آئے

میدنے سے بنا ڈالیں۔ کہ کھانے والا ایک بار ہاتھ بڑھالے تو پھر ہاتھ رکنا نہیں تھا اور اگر ایک نظر دیکھ لے تو کھانے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

ایک دن اخبار میں گلیک بنانے کی ترکیب پڑھ لی۔ اسی روز گلیک بنا ڈالا۔ پہلا پہلا گلیک تھا۔ بندہ چونکہ مسجد ار تھا اور اجزائے ترکیبی کے ملانے کے حساب کتاب سے واقف۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلا پہلا گلیک ہی بہت امید افزا رہا۔ اس نے ساتھی دوکانداروں کو ایک ایک ٹکڑا دیا۔ اور سب نے برٹنی تعریف کی۔ اس کے بعد کیا تھا گلیک کی وسیع دنیا میں جو آگے بڑھا تو بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک روز ایک گاڑی والے صاحب گلیک لینے آئے۔ تو واپسی پر ان کی گاڑی خراب ہو گئی۔ برٹنی کوشش کی مگر اسٹارٹ نہ ہوئی۔ وہ صاحب دوبارہ دوکان پر آئے اور اسے کھنے لگے کہ گاڑی کا خیال رکھنا میں ابھی کمینک کو لے کر آتا ہوں، اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا، اور ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ گاڑی کا بوئٹ کھول کر اندر دیکھا تو تاروں اور گل پرزوں پر مشتمل ایک بالکن ہی مختلف دنیا اس کی منتظر تھی۔ تاریں ادھر ادھر کر کے اس نے محسوس ان کو چھونے کی خواہش پوری کی۔ وہ صاحب جب کمینک کو لے کر آئے تو اس نے بھی گاڑی کے انجن میں اپنا سر جھکا دیا۔ سمجھ تو اسے کچھ نہ آتی۔ التبا ایک خواہش نے اس کے پاؤں روک لئے اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے گاڑیوں کی مرمت کا کام سیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

چند ہفتے کام کرنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک حد ہے جس کے آگے اس کے استاد کا علم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے تجسس اور دن رات کی محنت نے اس کے سامنے گاڑی کے گل پرزوں کے بہت سارے معاطات واضح کر دیئے۔

لہذا جلد ہی وہ اس مقام پر آئے کہ پٹرول اور ڈیزل سے چلنے والے انجن موٹر سائیکل، ٹریکٹر گاڑی، غرض کچھ بھی ہو اگر وہ اس تک پہنچ جاتا تو پھر مرمت ہونے بغیر واپس نہ جاتا تھا۔

کام پر گرفت بہت آہستہ آہستہ آئی اور یوں رفتہ رفتہ لوگوں کا اس پر اعتماد قائم ہونا شروع ہو گیا۔ گاؤں میں تو ایسی کوئی خاص گاڑیاں وغیرہ تھیں نہیں۔ البتہ سرنگ سے گزرنے والی گاڑیاں، پک اپ سوزوکی، ٹریکٹر، موٹر سائیکل والے اس کے کابک تھے۔ کام آگے بڑھ رہا تھا مگر ست رومی کے ساتھ۔ مگر اس کی سمجھ بوجھ بہت تیزی سے مختلف مراحل طے کر رہی تھی۔

مگر وہ جو اس کو گھمسا کہ لوگ اسے سمجھنے اور جاننے میں بہت دیر کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان تک اس کا شہرہ تب پہنچتا ہے جب وہ اس کام سے اکتانے لگتا ہے۔ بس ایک بات تھی جو اس کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔ دراصل یہ احساس اس بے چینی اور اضطراب کے بطن سے پھوٹا تھا جس کی تسکین کے لیے وہ اپنے آپ کو مختلف کاموں میں الجھائے رکھتا اور ہر گزشتہ سلجھانے کے بعد اسے ویسی ہی خوشی نصیب ہوتی جیسے ایک ریاضی دان کو ایک کلیہ معلوم کر کے یا پھر جیسے ایک فن کار کئی فن پارے بنانے کے بعد ایک ایسا فن پارہ بناتا ہے کہ جو باعث تسکین ہوتا ہے، اگرچہ یہ اطمینان بھی عارضی ہوتا ہے اور پھر اگلے ہی کسی لمحے فن کار اسی ازلی بڑپ اور بے چینی کے ہاتھوں بے بس ہو چکا ہوتا ہے۔

اس نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر مٹائیاں اپنے ہاتھ سے بنا کر بانٹی تھیں اس نے اپنی بہن کے جمیز کا فرنیچر خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کی لکڑی کے انتخاب کے لیے اس نے بڑی بڑی لکڑی منڈیاں وزٹ کیں کئی موقعوں پر لکڑی کو چرا کر اس کی خوشبو سوکھی کٹے ہوئے تختوں پر بنے والے لہریوں کو دیکھا اور کئی ہفتوں کی خواری کے بعد اس کو اپنی مطلوبہ لکڑی مل سکی اور پھر وہ کئی ہفتوں کے لیے ورکشاپ میں کھم کر بیٹھ گیا اور تب ہی اٹھا جب بہن کے جمیز کا تمام فرنیچر بنا چکا تھا۔

اس کا باپ جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اس کی مشینری کو بھی اس نے کئی

مرتبہ مرمت کیا۔

جس روز اس کے والد کا انتقال ہوا وہ گھٹ پر ہی تھا۔ اس کا والد حسب معمول معبب کی اذان سے کچھ دیر پہلے کھڑا آیا۔ اس نے اپنی پٹمی اتار کر تیار پانی پر رکھی۔ وہ پانی کی ماں پانی کا کٹورا بھر لائی۔ پانی پینے کے بعد وہ وضو کے لیے اٹھا، اور پھر نماز پڑھنے مسجد چھوڑ گیا۔

واپسی پر اس نے کھانا کھایا، کچھ دیر حشہ گڑ گڑا یا اور پھر چار پانی پر لیٹ گیا، عشاء کی اذان ہوئی اور نماز پڑھنے مسجد چھوڑ گیا واپسی پر چپکے سے چار پانی پر لیٹ گیا اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی ماں نے لاشیں کی لود جیسی کر دی۔ صبح چڑیوں کے چھانے کے بعد دیر تک جب اس کا والد نہ اٹھا تو اس کی ماں کو تشویش لاحق ہوئی۔ پاس آئی ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کا جسم بے حرکت تھا اس کی ماں نے کوئی بین نہیں کیا۔ روتی نہیں، بس چپکے سے اس کو جگا دیا۔ منہ سے کچھ نہیں بولی، اس کی آنکھوں میں ہی کچھ تھا جس کو دیکھ کر وہ ایک لمحے میں ہی سانس کی تہ تک پہنچ گیا۔

اب جو کور کن کی ڈھنڈیا پر مٹی تو معلوم ہوا سارا خاندان دریا پار کے گاؤں اپنے عزیز کے انتقال پر کل سے گیا ہوا ہے اور واپسی کی کوئی اُمید نہیں سارا دن گزر گیا تھا۔ دو تین نوجوانوں نے قبر کھودنے کے لیے اپنی خدمات پیش بن کیں مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

غمر کی نماز کے بعد اس نے کدال اٹھائی اور ضروری سامان لیا اور قبرستان چلا گیا۔ اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا اس نے کبھی اس سے پہلے گور کن کو قبر کھودتے ہوئے دیکھا بھی نہیں تھا قبر کا سائز بھی اس نے کچھ اپنے انداز سے اور کچھ ساتھ والی قبر کو دیکھتے ہوئے خود ہی طے کیا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد قبر بالکل تیار تھی وہ چاروں شانے چت خود پہلے اس میں لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی زمیں پسینے میں نہاتے ہوئے جسم کو بہت آرام دہ لگا۔

تھوڑی دیر یونہی لیٹنے کے بعد ایک عجیب طبع کی آسودگی کے ساتھ وہ اٹھا اور قبر

سے باہر نکلا۔ قبر اس کے انداز سے زیادہ گہری کھد گئی تھی۔ البتہ چوڑائی اور لمبائی میں اس کا سائز مناسب تھا۔

وہ کچھ پہنچا، نہادھو کر جنازہ کے لیے تیار ہوا۔ مسجد میں اعلان ہو رہا تھا: حضرات! نماز جنازہ کے لیے تشریف لے آئیے۔

والد کو قبر میں اتارنے کے بعد جب سارے لوگ واپس آ گئے۔ وہ آخری شخص تھا جس نے سب سے اخیر میں ایک بھرپور نظر قبرستان پر دوڑائی جہاں سینکڑوں قبروں کے نشان زمین کی سطح سے بلند ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نشان۔ اس کے والد کی قبر کا بھی تھا۔ جو اسے باقی قبروں سے یونسی قدرے مختلف محسوس ہو رہی تھی مگر یہ محض اس کا اپنا خیال تھا۔

وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے قبریں کھودنے کا شغل ہی اپنا لیا ہے جسے اس نے ابھی تک اپنا پیشہ نہیں بننے دیا۔ ہر قبر کی تیاری کے بعد اس کے چہرے پر ایک مختلف قسم کی طمانیت ہوتی ہے۔ وہ کتنی کتنی دیر تک قبر کے سرہانے بیٹھا اسے دیکھتا رہتا ہے اس کے کناروں کو آدھ آدھ لچک تراش تراش کرنے میں بھی حساب رکھتا ہے۔

لوگ اس کے پاس نہیں آتے، بلکہ جب بھی گاؤں میں کوئی انتقال کر جاتا ہے۔ وہ کچھ دیر مرنے والے کے کھربیشہ کر اپنے گھر آتا ہے اور ضروری سامان لے کر سیدھا قبرستان پہنچ جاتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں اس نے اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر اس شغل سے وابستہ کر لیا ہے، اسے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں وہ کہتا ہے کہ قبریں کھودنے کا کام اتنا دلچسپ ہے کہ اس کا دل بھرتا ہی نہیں اور میں اپنی جگہ مسلسل سوچ رہا ہوں کہ کہیں ہم سب اسے سمجھنے میں بہت دیر تو نہیں کر رہے۔

تنگون

ٹریں کے اس ڈبے میں یوں تو بے شمار مسافر بیٹھے ہیں مگر میں اس وقت اپنے غصہ صرف دو دوسرے مسافروں کا ذکر کروں گا۔ ہاں کھانی کے آخر میں شاید تیسرا کردار بھی شامل ہو جائے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔

میں یہ ساری بات اس لیے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ کو کھانی سمجھنے میں آسانی ہو۔ میرے دائیں طرف ایک بتیس چونتیس سال کا شخص ہے اور میرے سامنے بائیس چوبیس سال کی ایک خاتون۔ لڑکی اس لیے نہیں لکڑہا کیونکہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اور جس گھم آنے سے اس کا تعلق ہے وہاں ماں کو اتنی غذا میسر نہیں ہوتی کہ وہ بچوں کی پیدائش کے بعد لڑکی ہی رہے وہ عموماً عورت بن جاتی ہے۔

ہاں تو وہ شخص اپنی گود میں چھوٹے بیٹے کو بٹھائے ہوئے ہے جبکہ اس عورت کی گود میں بڑا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں میاں بیوی کی طرف میرا دھیان جانے کی دو وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ وہ عورت ہے جس نے بڑے بیٹے کو بڑے والہانہ انداز میں ایک بازو کے گھیرے میں لے کر اپنی گود میں بٹھایا ہوا ہے۔ اس کے سر اور شانوں پر سیاہ رنگ کی ایک چادر لپٹی ہوئی ہے جس پر ستارے ٹانگے ہوئے ہیں اور سیاہ چادر میں

صاف شفاف چہرہ بالکل روشن چاند کی طرح دمک رہا ہے۔

لڑکی کے خدوخال بالکل ویسے ہی ہیں جیسے میں آج کل اپنی بیوی کے بارے میں ایک خیالی پیکر بنائے ہوئے تھا۔ عمر کے وہ ایام یا چند ہفتے جو شادی سے پہلے کے ہوتے ہیں انسان ہر نظر آنے والے چہرے میں اپنی پسند و ناپسند کے نقوش نگاہ اور شناخت کرنے لگتا ہے اور کچھ ہی سبب تھا کہ میں نے اس عورت کو ایک جائزہ لیتی ہوئی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ جتنا عرصہ میرے سامنے بیٹھتی رہی، میری چسبستی ہوئی تیز پائی آنکھ اس میں کسی قسم کا ردِ عمل پیدا کرنے سے قاصر رہی۔

دوسری اہم وجہ وہ چھوٹا لڑکا تھا جو باپ کی گود میں بیٹھا تھا اور وہ تمام تر توجہ ملنے کے باوجود بہت بے چین اور مسلسل عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا۔ ان میں قابلِ ذکر حرکت یہ تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہاتھوں سے بڑے بھائی کو پیٹنے لگتا جو ماں کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا بھائی جو کہ عمر میں بیسی کوئی سال بڑا ہو گا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماں باپ چھوٹے بیٹے کو سمجھاتے، منع کرتے، مگر وہ اللہ بڑے بیٹے کو دل سادے رہے تھے۔

چھوٹا بھائی پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے بھائی کے منہ پر اچانک تھپڑ مار دیتا، اس کے گال کھینچنے لگتا یہ عجیب قسم کی حرکت مجھ سے دو چار بار سے زیادہ برداشت نہ ہوتی۔ اور پھر جب اس نے ایسا کیا تو میں نے بالکل اچانک ہاتھ آگے بڑھا کر چھوٹے بچے کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی، اور پیار سے پکارتے ہوئے کہا: "بھائی کو نہیں مار سکتے، پیار کرتے ہیں۔"

چھوٹے بیٹے نے تو اس پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا، البتہ اس کے والد نے کچھ ناخوشگوار انداز سے میری جانب دیکھا اور اپنے جسم کو ایک زاویے سے گھماتے ہوئے اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔

بڑی عجیب بات تھی۔ بچوں کو پیار کریں تو عام طور پر والدین بہت دوستانہ

انداز سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں تشکر سا جھلک جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ ہی الٹ تھا۔

میں نے بچوں کو قدرے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چھوٹا بیٹا تو ہو بہو باپ کی کاپی ہے البتہ بڑا بیٹا اپنے خدوخال کے اعتبار سے نہ تو ماں سے مشابہت رکھتا تھا اور نہ ہی والد کا عکس اس میں لہراتا تھا۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا اس کا قد مناسب تھا۔ البتہ اس کی صراحی دار گردن اسے قدرے لمبا بنا رہی تھی ناک کوئی ایسی نوک دار تو نہیں تھی مگر پھر بھی چہرے پر بہت نمایاں تھی بالوں کو جیسے ہاتھ سے کنگھی کر کے رہن میں باندھ دیا گیا ہو اور ہونٹ اپنی ساخت اور رنگت ہر دو اعتبار سے بہت جاذب نظر تھے ان کا رنگ زیادہ دودھ اور پتی ڈال کر پکائی ہوئی چائے کی طرح تھا۔ اور جہاں یہ رنگ ختم ہوتا تھا ایک قدرے محسوس ہونے والی گھبرے رنگ کی لائن سی بنتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ بغیر لپ اسٹک کے ایسے ڈیفائنڈ (Defined) ہونٹ میں نے اس قبل نہیں دیکھے تھے۔

ہاں تو میں نے جب بچے کے گالوں کو پیار سے چھوتے ہوئے اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی دوسری بار کوشش کی تو بچے کو مجھ سے قدرے دور کرتے ہوئے وہ شخص کہنے لگا۔ "میں خوب جانتا ہوں آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک بات ذہن میں رکھیے اب کی بار ایسا نہیں ہوگا۔" وہ شخص تو بالکل لڑائی کے لمحے میں بولا میرے لیے اس کا لہجہ اور جملہ دونوں ہی حیران کن تھے عجیب سے گھبرائے ہوئے انداز میں میں نے اس سے پوچھا "تم کیا جانتے ہو؟ اور اب کی بار کیسا نہیں ہوگا؟"

وہ شخص بے دھڑک بولا: "بالکل آپ کی طرح ہی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی ٹرین میں ہی ملا تھا۔ یونسی بات شروع ہوئی تھی۔ ہم اترے اور وہ بھی اسٹیشن پر ہی اتر گیا۔ ساتھ ساتھ چلنے لگنے لگا تھوڑی دیر آرام کروں گا بہت لمبا سفر کرنا ہے تھوڑی دیر رک کر تازہ دم ہو کر چلا جاؤں گا۔"

اچھا تو پھر۔۔۔۔ میں نے اس انداز سے پوچھا کہ جلدی جلدی ساری بات بتا ڈالے۔
 پھر کیا۔۔۔؟ وہ تو چلا گیا مگر چند مہینے بعد جب میرے گھر بیٹا پیدا ہوا تو پہلے تو
 میں خوشی سے پاگل تھا میں نے غور نہ کیا۔ چند مہینے بعد ایک روز اچانک ہی مجھے اپنے
 بیٹے کو دیکھ کر وہ شخص یاد آ گیا جوں جوں میرا بیٹا بڑا ہوتا گیا۔ اس کے نقوش اس شخص
 کے خدوخال میں دھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اور بعد میں تو لوگوں نے منہ پر کونا
 شروع کر دیا کہ نہ تو ماں پر ہے اور نہ ہی باپ کی مشابہت ہے۔ عجیب عجیب انداز سے
 لوگ باتیں کرتے تھے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی وہ عورت جو اس کی بیوی تھی اور
 بڑے بیٹے کو والہانہ انداز میں ایک بازو کے گھیرے میں لیے بیٹھی تھی، مجھے تھوڑی دیر
 کے لیے کوئی الپسرا لگی۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔
 میرے لیے یہ بات بہت دلچسپی کا باعث تھی۔

اس شخص کی سوچ عجیب جاہلانہ اور بے سرو پا تھی اور میں ایک لمحے کے لیے اس
 بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

باقی سفر جتنا بھی کٹا میں چوروں کی طرح دبا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس تمام عرصے
 میں اس شخص نے چھوٹے بیٹے کو اپنی گود میں ہی رکھا۔ اور راستے میں مختلف طرح کی
 چیزیں لے کر دیتا رہا۔ کبھی ٹافیاں کبھی آئس کریم اور کبھی بوتل۔ مگر بڑے بیٹے کو جو
 ماں کی گود میں دبا پڑا تھا۔ ایک آدھ بار ہلکے سے پوچھا، جس پر اس نے انکار کر دیا۔

وہ عورت کہ جسے میں لڑکی نہیں کہہ سکتا تھا تمام راستے گرد و پیش سے بے نیاز اور
 بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے خاوند کی کوئی بات سنی یا نہیں،
 معلوم نہیں۔ دیکھنے میں وہ قدرے پڑھی لکھی اور ہسٹرنگ رہی تھی جب کہ اس کا خاوند
 شاید اخبار پڑھ سکتا ہو۔ ہو سکتا ہے اخبار بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور صرف دستخط کر سکتا ہوگا،
 اور شاید دستخط بھی نہ کر سکتا ہوگا۔ ایسے شخص کا کیا خواب ہوگا جس کی تعبیر وہ بچوں میں
 تلاش کرے گا۔

ہاں مگر اس لڑکی کا خواب ہو سکتا ہے جسے وہ اپنی اولاد میں ہی تلاش کر سکتی ہے وہ لڑکی جو کہ بائیس چوبیس سال کی عمر میں ایک مکمل عورت بن گئی تھی اس کا آئیڈیل اس کے بیٹے کی شکل میں جب جوان ہوگا تو کیا تمام عمر محض خوابوں کے سہارے گزارنے والی چند خواب اپنے بیٹے کو منتقل کر سکے گی اور اس شخص کا آئیڈیل جب چھوٹے بچے کی صورت میں نمودنما پائے گا، پروان چڑھے گا تو کیا ایک ہی گھر میں پیدا ہو کر پروان چڑھنے والے بچے اپنے درمیان بانیوں کا سا تعلق قائم کر سکیں گے۔

یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے بے تاثر و بے زبان بیٹھی ہے اس کے اظہار کی یہ خوفناک شکل کس انجام کو پہنچے گی؟ یہ سفر کب ختم ہوگا؟ کوئی اسٹیشن بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی منزل سے پہلے ہی اتر جاتا۔ اور ان نظر والے غیر انسانی وجودوں سے خود کو دور کر لیتا مگر گاڑی چلتی جا رہی تھی چلتی جا رہی تھی۔

یہاں سے کھانی میں تیسرا کردار داخل ہوتا ہے اور وہ ایک ادھیر عمر کی عورت ہے جو سامنے والی سیٹ پر اس لڑکی نما عورت کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔ اس ادھیر عمر عورت کا شاید میں نوٹس بھی نہ لیتا۔ مگر جب ٹکٹ چیکر نے آکر ان سے ٹکٹ مانگے تو اس ادھیر عمر عورت نے اپنے پرس میں سے تین ٹکٹ نکال کر دکھائے۔

یہ ادھیر عمر عورت اپنے خدوخال کے اعتبار سے نہ تو لڑکی کی ماں لگتی تھی اور نہ ہی لڑکا اس کا بیٹا لگتا تھا۔ تو پھر اس عورت کا ان دونوں کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟ انسانی رشتوں کے باہمی تعلق کو خدوخال کی مناسبت سے تلاش کرنے میں کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو مجھے کچھ وقت دیجیے۔ تاکہ گاڑی آہستہ ہونے پر میں رشتوں کی اس نکتوں سے باہر نکل جاؤں مگر گاڑی ہے کہ چلتی جا رہی ہے چلتی جا رہی ہے۔

(نومبر ۱۹۹۳ء)

